ہندوستان کے تمام دار المطالعوں اور علمی اداروں کو بلا قیمت

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۶۱

فلم

سید سعد اللہ قادری میڈل کمیٹی

کا ماہ نامہ

قیمت ایک آنہ

جلد ۳ شمارہ ۲ تا ۴ — حیدر آباد دکن — اپریل ۱۹۴۱ع

بمبئی ٹاکیز کی شہرۂ آفاق فلم "پنر ملن" کا ایک جاذب نظر سین
جو پیلس ٹاکیز میں چار ہفتوں سے نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے

نواب مرزا محمد علی بیگ صاحب جاگیردار

(رکن کمیٹی انتظام پائیگاہ نواب لطف الدولہ بہادر مرحوم و مغفور)
آپ کے زمانۂ رکنیت میں دفاتر پائیگاہ کی تنظیم ہوئی۔ تعلقداری، عدالت، دواخانہ اور مدرسے کے لئے عالیشان عمارتیں بنائی گئیں۔ ”عمرگہ“ کی موجودہ رونق آپ کی انتھک کوششوں کی رہین منت ہے۔ چنانچہ بہترین انتظام، وسیع تجربے اور اعلیٰ کارگزاری کے صلہ میں آپ کی مدت ملازمت میں حسب ”فرمان خسروی“ حال ہی میں ایک سال کی توسیع ہوئی ہے۔

جسٹس نواب ناظر یار جنگ بہادر

(ام، اے - یل یل، ڈی (کیمبرج) بیرسٹر ایٹ لا)
رسالہ فلم کے سرپرست اور قدرداں۔ سید سعد اللہ قادری میڈیکل کمیٹی کے ممبر۔ آپکی مدت ملازمت میں حسب ”فرمان خسروی“ ایک سالہ توسیع منظور ہوئی۔ جس پر ”ادارہ فلم“ آپکی خدمت میں مبارک باد عرض کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے۔

مسٹر قاسم علی فاضل - مالک دلشاد ٹاکیز

اخبار وقت مورخہ ۱۹ - فبروری میں یہ اطلاع درج ہے کہ دلشاد ٹاکیز پر ۱۷ فبروری کو ہندوں اور آریہ سماجیوں نے محض اس بنا پر پکٹینگ کی کہ سنیما اور کھیل دونوں مسلمانوں کے ہیں - یہ پکٹینگ اس وقت ہوی جب کہ ”حاتم طائی کی بیٹی“ نامی فلم دکھائی جارہی تھی -

اداریہ

قومی زبان اردو کے بہی خواہ یہ معلوم کر کے مسرور ہوں گے
کہ اُن کی زبان نہ صرف ہندوستان گیر حیثیت رکھتی ہے
بلکہ دنیا کے تمام متمدن ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔
اور اس کے اچھے اچھے اہلِ قلم دنیا کے اس سرے سے
اُس سرے تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اردو کی عالمگیر مقبولیت کا تازہ ترین ثبوت
یہ ہے کہ انگلستان، جرمنی، اٹلی، ترکی اور جاپان سے
روزانہ ہماری زبان ہی میں پروگرام نشر کیے جا رہے
ہیں۔ ہندی کے بہی خواہ اسے غیر زبان تصور نہ کریں۔
کیونکہ یہ ان ہی کے آبا و اجداد کی یادگار رہے۔ جو صدیوں
کے باہمی میل جول سے بنی ہے۔ اردو ہندی کے
فروغ و احیا کی جو الگ الگ کوششیں ہو رہی ہیں۔
وہ ایک ہی مرکز پر آ جائیں تو بہت اچھا ہوگا۔ اس اتحاد
سے نہ صرف ملک ترقی کرے گا بلکہ لسانی یکسانی ہم کو
آزادی سے قریب تر کر دے گی۔ ہمارے زعما کو چاہئیے
کہ وہ اس اہم مسئلہ کے حل پر فوراً توجہ کریں۔

جنگ اور امن موجودہ جنگ نے جہاں امن عالم کو
خطرہ میں ڈال دیا ہے وہاں اس نے ہندوستانیوں
کی معاشی حالت بھی قابل رحم بنا دی ہے۔ چنانچہ
دن بدن آمدنی کی راہیں تجارتی کاروبار کی مسدودی
کے باعث بند ہو رہی ہیں۔ اگر چند دنوں یہی لیل و نہار
رہا تو اہلِ ہند کا بڑا برا حال ہوگا۔ اس لئے انھیں
چاہئیے کہ جنگ کے کامیاب اختتام کے لئے اپنی
تمام امکانی قوتیں صرف کر دیں۔ اس سے ایک تو دنیا
میں پھر امن عود کر آئے گا دوسرے ہندوستان کو
معاشی بدحالی سے نجات مل جائے گی۔

مولوی سید احمد محی الدین صاحب رضوی انسپکٹر جنرل رجسٹریشن آپ کا شمار حیدرآباد کے ان بیدار مغز
حکام میں ہوتا ہے۔ جن کے اسماء انگلیوں پر گنے جاتے
ہیں۔ جس زمانہ میں آپ تعلقداری سے انسپکٹر جنرل کے عہدہ
پر فائز ہوئے۔ دستور العمل انتقال اراضی و معافی فیس رجسٹری
انجمن ہائے امداد باہمی اور مصالحت قرضہ وغیرہ نفاذ پا چکے
تھے۔ اسی اثنا میں جنگ چھڑ گئی! اور اس نے طول کھینچا۔
جس کی وجہ سے ملک کی معاشی حالت حد درجہ سقیم ہو گئی۔
اس کا اثر ممالک محروسہ کے ان تمام سررشتہ جات پر پڑا۔
جو مادی فائدہ پہونچاتے ہیں۔ اگر ایسے نازک دور میں
موصوف سا مدبر اس عہدہ جلیلہ پر مامور نہ ہوتا تو اندیشہ
تھا کہ اس اہم سررشتے کے حالات پیچیدہ ہو جاتے
اور اُن کو قابو میں لانا مشکل ہوتا۔ مگر موصوف نے
انتہائی دانشمندی سے آنے والی مشکلات کا سدباب
کر دیا۔ اس کا اندازہ آپ کی اُن مفید تجاویز سے
ہوتا ہے جو حکومت کے زیر غور ہیں۔ توقع ہے کہ
آپ کے حسن انتظام سے مستقبل قریب میں سررشتہ
رجسٹریشن کے ذرائع آمدنی میں وسعت پیدا ہو جائیگی۔

مولوی غلام محمد مصطفیٰ صاحب

مولوی غلام محمد مصطفیٰ صاحب مددگار باب حکومت ورکن بلدیہ حلقہ الف ہمارے ملک کے خاموش خدمت گزاروں میں ہیں آپکی ذات گرامی نام ونمود سے بے نیاز رہی۔ آپنے ملک و مالک کی جو وفادارانہ خدمات بجا لائی ہیں۔ وہ عالم آشکار ہیں۔ موصوف کی ہمہ گیر ہردلعزیزی اور بلند ترین شخصیت کا اس سے ثبوت ملتا ہے کہ آپ کو زمانہ تحصیلداری میں عوام "دیو تحصیلدار" کے ممتاز لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔

آپ کا مسلک ہمیشہ صلح کل اور بنی نوع انسان کی ہمدردی رہا ہے۔

آپ کی توجہ سے حلقہ الف میں کئی انجمنیں اور علمی ادارے عالم وجود میں آئے لیکن آپ کے تبادلہ نے ان کو گوناگوں مشکلات میں مبتلا کردیا ہے اور ہر اہل محلہ کو آپ کے تشریف لیجانے کا دلی قلق ہے۔

آپ کو ملک میں اور خصوصاً حلقہ الف میں جو غیر معمولی ہردلعزیزی حاصل رہی اُس کا سرسری اندازہ موقر روزنامہ صبح دکن مورخہ ۹ خورداد کی حسب ذیل شایع کردہ اطلاع کے ملاحظہ سے ہوگا۔ (ادارہ)

حیدرآباد ۸ خورداد مولوی غلام مصطفیٰ صاحب مددگار معتمد باب حکومت ورکن بلدیہ حلقہ الف کل سات بجکر ۱۰ منٹ رات کی ٹرین سے کاچی گوڑہ اسٹیشن سے راہی جالنہ ہوئے۔ وہاں آپ ڈویژنل افسری کی خدمت کا جائزہ حاصل کریں گے شام کے چھ بجے ہی سے معززین جوق درجوق اسٹیشن پر جمع ہو رہے تھے۔ یہ سلسلہ برابر سات بجے تک جاری رہا سینکڑوں ہندوں اور مسلمانوں سے پلیٹ فارم بھر گیا تھا بیشمار ہندوں اور مسلمانوں نے پھول پہنائے اور ضامنیاں باندھیں۔ مولوی غلام مصطفیٰ صاحب اپنے مکان سے اسٹیشن تک پیادہ پا آئے۔ آپ کو سینکڑوں اہل محلہ گھیرے ہوئے تھے۔ یہ نظارے خاص کیفیت پیدا کررہے تھے جس سے عقیدت ومحبت اور عام شیفتگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تقریباً پونے سات بجے مسٹر کرشنا چاری بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل ہائیکورٹ نے موصوف کی گرانقدر خدمات کے اعتراف میں باشندگان حلقہ الف کی جانب سے ایک برجستہ وبلیغ تقریر فرمائی اور نہایت والہانہ انداز میں موصوف کی زریں خدمات کا اعتراف کیا اور حلقہ الف کے باشندوں کی فلاح وبہبود کے متعلق موصوف نے جو مساعی فرمائے ہیں اُن کا پُراثر الفاظ میں ذکر کیا اور تقریر ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ حلقہ الف محض مولوی غلام مصطفیٰ صاحب کی بدولت ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہے اس کے بعد مولوی غلام مصطفیٰ صاحب نے جوابی تقریر فرمائی اور کہا کہ جو کچھ خدمات مین نے انجام دی ہیں یہ سب کچھ آپ حضرات ہی کی امداد واعانت کا نتیجہ ہیں اگر آپ میری معاونت نہ فرماتے تو مین کسی کام کے لائق نہ تھا دراصل میری یہ خدمات آپ حضرات کی پیہم عنایتوں کی شرمندہ ہیں۔ آپنے میری نسبت جو کچھ ارشاد فرمایا اس سے بہت زیادہ مین آپکا مداح ہوں مین نے اس حلقہ کی جو کچھ خدمت کی اپنے نام ونمود کے لئے نہیں بلکہ شہر کے خادم اور ملک مالک کے ایک ادنیٰ جانثار کی حیثیت سے کی مین ہر شہری پر یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ وہ غیر متزلزل طور پر آقائے ولی نعمت اور خانوادہ آصفی کے سچے پرستار رہیں اور آقائے ولی نعمت کے زیر سایہ بلا تخصیص مذہب وملت رواداری اور امن کے ساتھ اپنی اور اپنے اہل شہر کی فلاح وبہبود کیلئے راہیں تلاش کریں آپ حضرات نے مجھ ناچیز کو "خدا حافظ" کہنے کی خاطر یہ جو زحمت برداشت فرمائی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان قاصر ہے۔

خدا حافظ کہنے والوں میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ نواب ناصر یار جنگ بہادر۔ کرنل باجاج۔ علامہ حکیم سید شمس اللہ قادری ایڈیٹر تاریخ مولوی مبارز الدین خان صاحب معتمد اسٹیٹ نواب فخر الملک بہادر مولوی رحمت اللہ شریف صاحب اول تعلقدار بلدہ مولوی محمد بیگ صاحب ناظم اسٹیٹ مہاراجہ بہادر۔ پروفیسر محمود علی صاحب مولوی سید سعد اللہ صاحب قادری ایڈیٹر قلم۔ مولوی سردار الدین صاحب تعلقدار صرفخاص مبارک مسٹر جگی راج صاحب دلیپا ایڈیٹر راجنیتی۔ مل صاحب۔ مسٹر کرشنا چاری صاحب بی۔اے۔ ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ۔ نواب اکبر حسین علی خان صاحب نواب مصطفیٰ یار خان صاحب۔ مولوی عبدالمجید صاحب انجنیر۔ نواب میر ببر علی صاحب وغیرہ۔

اُردو اور فلم ساز

از مولوی سید امداد اللہ قادری (حیدرآبادی)

مولوی سید امداد اللہ صاحب قادری نے فلموں کی زبان کے حل پر ذیل کا محققانہ و مبصرانہ مضمون تحریر فرمایا ہے۔ جو اس قابل ہے کہ اُسے ہر بہی خواہِ اُردو پڑھے، اور عمل کرے۔ "ادارہ"

ہندوستانی صنعت فلم کے نشوو ارتقا کا مطالعہ کرنے والے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہماری فلموں نے جب قوت "گویائی" حاصل کی۔ تو اُردو ہی اُن کا ذریعہ اظہار رہی۔ تمام ملک میں اس کے علاوہ کوئی دوسری زبان ایسی نہ تھی۔ جو اس کی ہمسری کا دعویٰ کرسکتی۔ فلم ساز اُردو فلم تیار کرنے پر کیوں مجبور رہے یہ ایک نہایت دلچسپ اور معرکہ آرا بحث ہے۔

ہندوستان میں صنعت فلم کے رواج پانے سے مدتوں پہلے ناٹک کا دور دورہ تھا۔ اور اس کا انتظام پارسیوں کے ہاتھ میں تھا۔ پارسی اپنے تماشے کچھ عرصہ تک صوبہ واری زبانوں میں کرتے رہے لیکن انھیں بجائے نفع کے نقصان اٹھانا پڑا۔ تو انھوں نے مجبوراً اُردو کی جانب توجہ کی۔ اس تبدیلی کے بعد چند ہی دنوں میں ان کے کھیلوں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوی۔ اور وہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہایت کامیابی سے چلنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے دیکھتے کئی ناٹک کمپنیاں ملک کے طول وعرض میں قایم ہوگئیں۔ جن لوگوں کو اسٹیج اور اُس کی تاریخ سے دلچسپی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کمپنیوں نے کتنا روپیہ پیدا کیا۔ اور ان کے تماشوں نے ملک کی تہذیب اور زبان پر کیا اثر ڈالا۔

صنعتِ فلم نے جنم لیا تو اسٹیج کی مثال سامنے تھی۔ فلم ساز اسٹیج کی ناکامی اور کامیابی کے وجوہ سے بھی واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے سابقہ مشاہدات اور تجربات کے مدنظر ہندوستان کی عالم گیر زبان اردو میں فلم بنانے شروع کئے۔ ان فلموں کو جو قبول عام نصیب ہوا اُس سے بھی سب واقف ہیں یہی وجہ تھی کہ ہر نئے فلم کی مہینوں نمائش ہوتی تھی اور ہزاروں کیا لاکھوں اسے دیکھتے تھے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ عالم آرا، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، اور حاتم طائی وغیرہ فنی اعتبار سے نہایت ادنیٰ درجہ کی تصاویر متحرکہ تھیں اور ان کی لاگت بھی چالیس پچاس ہزار سے زائد نہ تھی۔ لیکن چونکہ وہ ملک کی بین القومی مشترکہ

زبان میں تھیں۔ اس لیے ملک کے گوشے گوشے میں ان کا گرمجوشانہ خیر مقدم کیا گیا۔ فلم ساز ان کی بدولت لکھ پتی بن گئے اور ہر شخص صنعت فلم کو سونے کی کان سمجھنے لگا۔

ہماری صنعت نے اپنی پہلی منزل ختم کر کے دوسری منزل میں قدم رکھا تھا کہ ملک میں جگہ جگہ کمپنیاں قایم ہونے لگیں اور ایک سال کے اندر اندر ان کی تعداد سو سے متجاوز ہو گئی۔

اسی اعتبار سے ڈائرکٹروں، ایکٹروں، ایکٹرسوں، فن دانوں، نمایش خانوں اور تقسیم کنندگان فلم کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اور یہ صنعت ملک کے چالیس پچاس ہزار نفوس کا مستقل طور پر ذریعۂ معاش بن گئی۔ فلموں کی فنی خامیوں پر بھی غور و خوض ہونے لگا۔ اور انہیں دور کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ فلمی جرائد کا اجرا عمل میں آیا۔ پبلک نے انجمنیں قایم کیں۔ تا کہ فلم سازوں کو اس سے باخبر کرتے رہیں کہ ملک کس قسم کی تصاویر چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ صنعت کی بقا اور اس کی ہر جہتی فلاح و ترقی کے لیے یہ بنیادی کام ہو رہا تھا۔ اہل ملک کے انہماک سے اس کی توقع ہو چکی تھی کہ یہ صنعت نہ صرف تجارتی اعتبار سے کامیاب ثابت ہوگی بلکہ وہ ہماری سماج کے مذموم رسم و رواج کی بھی اصلاح کرے گی۔ اتحاد و اخوت کے رشتہ کو مستحکم کر دے گی۔ ان چیزوں کے قطع نظر تمام ملک کی زبان کو ایک مرکز پر لے آئے گی اور زبان کی یکسانی کی بدولت تجارت و حرفت کو ترقی ہوگی۔

ہمارا ملک ازل کا بدقسمت ہے اس کی تاریخ خود شاہد ہے کہ ہندوستان کو دنیا کی کسی قوم نے نقصان نہیں پہونچایا۔ اگر پہونچایا تو خود ہندوستانیوں نے، اسی طرح اس صنعت کی تعمیر میں تخریب کا باعث ہمارے زعما و رہنما ہوئے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہماری صنعت کے ابتدائی دو تین برسوں میں "خالص اردو زبان میں تصاویر تیار ہوتی رہیں۔ اور فلم ساز تشہیر میں بطور خاص اس امر کی صراحت کرتے رہے کہ" یہ فلم خالص اردو زبان میں ہے" یہ توضیح فلم ساز اس لیے کیا کرتے تھے کہ ان کا فلم کسی خاص زبان کی تخصیص کے باعث محض صوبہ واری بن کر نہ رہ جائے اور اس کا آمدنی پر بُرا اثر نہ پڑے۔ اسی زمانہ میں اردو کی غیر معمولی ہر دلعزیزی اور ترقی سے خائف ہو کر بہی خواہانِ ہندی نے ربع صدی کے مسلسل سکوت و جمود کے بعد پھر ترویج ہندی کی مہم از سر نو شروع کی۔ اور کئی مجالس ملک کے مقتدر و سربرآوردہ حضرات کی سرپرستی میں بدیں غرض قایم کی گئیں، کہ سرکاری دفاتر میں اردو کی جگہ ہندی کو دلوائی جائے رسم الخط بدلا جائے۔ حکومت کو متاثر کرنے کے علاوہ انفرادی ادارہ جات اور مصنفین و ناشرین کو ترغیب و تحریص کے ذریعہ اُردو کی خدمت سے باز رکھا جائے۔ نہ صرف انھوں نے اسی پر اکتفا کیا بلکہ جوش دلا کر اُن میں تعصب پیدا کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کے بڑے بڑے محسن اور خدمت گزار اس کی سرپرستی سے دست کش ہو گئے[1]

[1] منشی نولکشور آنجہانی اور ان کے مطبع نے اردو زبان و ادب کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں وہ اردو ادب کی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۷)

اس کے بعد ہماری زبان کے ذرایع نشر و ترویج کی سدودی اور روک تھام پر عاجلانہ توجہ کی گئی۔ اس سلسلے میں فلم سازوں کو زبان کی تبدیلی پر مجبور کیا گیا۔ اس میں یہ حضرات بڑی حد تک اس وجہ سے کامیاب ہو گئے۔ کہ فلم سازی کے تمام شعبہ جات ان کے ہم مسلک افراد سے وابستہ ہیں۔ زبان کی تبدیلی کے بتدریج ان افراد کی بے دخلی شروع ہوئی۔ جن کا تعلق غیر اقوام سے تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ان کوششوں سے ہماری زبان کو نقصان پہونچا۔ لیکن اُسے خطرناک اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی خاص مقصد سے نہیں تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ناگپور میں "بھارت ساہتیہ پرشد" کا "رسوائے عالم" اجلاس ملک کے سب سے بڑے سیاسی رہنما اور ہندو مسلم اتحاد کے داعی اعظم مہاتما گاندھی کی ممتاز صدارت و قیادت میں منعقد ہوا۔ اس میں اور اس کے بعد آپ نے جو کچھ ارشادات فرمائے ان کا ماحصل یہ ہے۔

> "اردو قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے اس میں عربی، فارسی کے کثیر الفاظ ہیں۔ اس لیے یہ ہمارے ملک کی زبان نہیں ہو سکتی ہمیں ہندی کی ترویج و ترقی کی کوشش کرنی چاہیے۔ تاکہ سارے ملک کی یہی زبان ہو جائے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی اردو کے علمی زبان بنانے میں ان کا غیر معمولی حصہ ہے۔ ان کے اس احسان سے اردو کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ تاریخ زبان اردو کا کوئی مصنف ان کی خدمات کا اعتراف کیے بغیر اپنی کتاب ختم نہیں کر سکتا۔ منشی صاحب کا نام اردو زبان کی تاریخ کا خود ایک مستقل اور اہم ترین جزو بن گیا ہے۔ بہی خواہان اردو کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ جس بزرگ نے تن من دھن سے جس زبان کی خدمت کی اور اس کو اپنے بزرگوں کی میراث سمجھ کر موجودہ درجہ پر پہونچایا۔ اُس کے اخلاف بر خلاف اس کے ترویج ہندی میں ساعی ہیں۔ انھوں نے اردو مصنفین کی امداد و دستگیری سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اردو کتب کی طباعت بڑی حد تک موقوف کر دی ہے۔ اور اس کے بجائے ہندی کتب کی طبع و اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے ہیں۔

محسنین اردو کی خدمات کے سلسلے میں رام نراین لال، لالہ بنارسی داس، منشی گلاب سنگھ، لاجپت رائے اینڈ سنس اور انڈین پریس الٰہ آباد وغیرہ کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا انتہائی محسن کشی ہوگی۔ اردو زبان میں جو ادبی سرمایہ نظر آ رہا ہے اور ہماری زبان دنیا کی ترقی یافتہ السنہ میں شمار کے قابل بن سکی ہے ان میں ان بزرگوں کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن انتہائی افسوس ہے کہ ان کے جانشیں افتاد زمانہ کے مدنظر ان کے برعکس عمل کر رہے ہیں۔ اور اس میں ان کا غلو دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس سخت تعصب کے باوجود ملک میں برادران ہنود کی ایک بڑی مقتدر جماعت انتہائی انہماک اور تن دہی سے اردو کی خدمت کر رہی ہے۔ اور ہندو مسلمانوں کی اس مشترکہ میراث کی حفاظت کو اپنا فرض عین سمجھتی ہے۔ اس خصوص میں اپنے بے لوث خدمت گزاری کے لیے سر تیج بہادر سپرو، برج موہن دتاتریہ کیفی، منشی دیا نراین نگم، منشی منوہر لال زتشی، مولوی مہیش پرشاد وغیرہ کے اسمائے گرامی بطور خاص قابل تذکرہ ہیں۔

گاندھی جی نے یہ کہہ کر اردو ہندی کو ایک دوسرے سے بالکل الگ کر دیا۔ اب تک اردو کی ترقی میں ہندو برابر کے شریک تھے۔ لیکن محب ملک. وقوم کے اس ارشادِ گرامی کا یہ اثر ہوا کہ ملک میں دو مکتب خیال ہو گئے۔ جیسا کہ اس سے قبل لکھا جا چکا ہے ہندوؤں نے اردو سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اسی زمانہ میں سات صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قایم ہو گئیں ان حکومتوں نے اپنے قائد کی اتباع میں ہندی کی نشر و ترویج میں جو غلو دکھلایا۔ اس کا سرسری اندازہ صرف اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صوبہ مدراس میں ہزاروں آدمیوں کو صرف اس بات پر جیل بھیجا گیا کہ انھوں نے اپنی مادری زبان "تامل" کے تحفظ اور ہندی کی ترویج کے خلاف ستیا گرہ کی تھی۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہوگا کہ صوبہ متحدہ جو اردو کا گہوارہ ہے جس کا ہر باشندہ اہل زبان کہلاتا ہے۔ اور جس کی بول چال زبان کے معاملہ میں سند کا حکم رکھتی ہے۔ اسی صوبہ کی کانگریسی حکومت نے جو اصطلاحات وضع کیں۔ اُن کو ہندو مسلم اکابرین اور ماہرین السنہ نے "جناتی" زبان کا لقب دیا ہے اس سے اہل بصیرت خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ دیگر صوبجات میں اردو کو نقصان پہونچانے اور معدوم کرنے کی کیا کوشش نہ کی گئی ہوں گی۔ غیر سرکاری تحریکوں کے علاوہ حکومت اور اپنے زعماء میں فلم سازوں نے تغیر دیکھا۔ تو زبان کو شدھ کرنے میں غلو برتنے لگے۔ اور ایک آدھ برس کے اندر ہی فلم کی زبان اردو کے بجائے ہندی ہو گئی۔ عربی فارسی کی جگہ سنسکرت کے مغلق اور نامانوس الفاظ نے لے لی۔ اس طرح فلموں کے ذریعہ آج سے ہزار سال قبل کی دقیق سنسکرت کی اشاعت شروع ہوئی

ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ حکومت کے طور و طریق رعایا کو سیکھنے پڑھنے ہیں اور اُس کے ہر جا و بیجا حکم پر سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے کانگریس کی قومی حکومت نے اپنے زمانہ اقتدار میں اپنے فرقہ کی جانب داری میں اقلیتوں پر جو بے پناہ مظالم کئے ہیں۔ اُس سے سب واقف ہیں حکومتی اقتدار کے گھمنڈ میں تمام اقلیت رکھنے والی جماعتیں اچھوت تصور کی جانے لگیں۔ لیکن اس طرز عمل سے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔

فلم ساز، ابتداء میں مسلمانوں کی شجاعت، بہادری، اور ان کی انصاف پروری کے قصص فلماتے تھے مگر زمانہ کا رنگ دیکھ کر انھوں نے نہ صرف زبان میں تبدیلی کی۔ بلکہ قصص کے پلاٹ بھی سرے سے بدل دیئے۔ اب اُن کا ماحصل یہ ہونے لگا کہ مسلمان غاصب و غدار ہیں۔ انھوں نے ہماری عزت و ناموس پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ ہماری آزادی سلب کر لی ہے وہ لٹیرے اور ڈاکو ہیں۔ اُن کا وجود ہمارے لئے موجب خطر ہے۔ یہ پلاٹ ایک آدھ فلم ہی میں پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے ثبوت میں بیسیوں فلم نام بنام گنائے جا سکتے ہیں۔ اس قبیل کی فلموں کی تیاری کا واحد مقصد جلب منفعت کے علاوہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے کردار کو ادنیٰ قسم کا بتا کر اُن سے ہندوؤں اور دیگر اقوام کو خائف و متنفر کیا جائے تاکہ وہ مسلمانوں کے وجود کو ہندوستان کے حق میں ایک بدنما داغ تصور کریں

اگر ہندوستانیوں کے موجودہ افتراق کے اسباب پر نظر غایر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا ایک سبب فلم و زبان ہیں۔ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ اس قبیل کی منافرت پیدا کرنے والی فلموں کا دیکھنا یک لخت موقوف کر دیا جائے۔ اور ایسی فلمیں بھی نہ دیکھی جائیں۔ جن میں سنسکرت کے مغلق ناموس ثقیل الفاظ ہوں۔ اگر کچھ عرصہ تک ایسی فلموں کا دیکھنا قطعی مسدود کر دیا جائے تو نہ صرف اس پروپاگنڈہ کا جو بڑی حد تک ہمارے پیشہ پر ترقی پا رہا ہے۔ سدباب ہو جائے گا۔ بلکہ فلم سازوں نے اردو کے خلاف جو متحدہ محاذ بنا رکھا ہے مالی خسارہ کی بدولت ان کا یہ طلسم بھی ٹوٹ جائے گا۔ اس وقت ان کو اس کا احساس ہوگا کہ ان کے یہ فلم کس کے بل بوتے پر اس شدومد سے اب تک چلتے رہے ہیں اور ان پر یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ہماری عدم سرپرستی ان کے حق میں کس درجہ مضر و خطرناک ہے یہ سب کچھ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہمدردانِ اردو اور خاص کر مسلمان ثابت قدم رہیں۔ نیز مسلمان صاحبان ثروت کو چاہیے کہ وہ دیگر صنعتوں کی طرح اس صنعت پر بھی اپنا روپیہ لگائیں۔ اس سے ایک تو یہ ہوگا کہ تمام مسلمان ان کی تیار کردہ فلمیں دیکھیں گے۔ دوسرے اس کے ذریعہ مسلمان ماہران فن کی پرورش ہوگی تیسرے مسلمانوں میں دن بدن جو مالی پستی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا بڑی حد تک ازالہ ہو جائے گا اور وہ طبقہ جو عزلت و فلاکت میں زندگی بسر کر رہا ہے آرام کی زندگی بسر کرے گا چوتھے ملک کی تجارت و حرفت میں ترقی ہوگی اس کے علاوہ سب سے بڑی خدمت جو انجام دی جا سکے گی وہ زبان کی ہوگی!

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۵) روش کا نتیجہ ہے۔ جو انھوں نے گزشتہ دو سال سے اختیار کر رکھی ہے۔

اس حالت میں جب تک نیو تھیٹرز کی پستی اور ہندوستان کے فلم بیں طبقہ کی پریشانی کی انتہا نہ تھی۔ اچانک تاریک فضا کے سینہ کو چاک کر کے امید کی ایک شعاع دوڑ گئی۔ یہ ہے اس کمپنی کی آخری فلم "لگن" جس نے اپنی خوبیوں کی بدولت پھر پریزیڈنٹ اور ودیاپتی کے مقابلہ میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ یہ ایک انتہائی شاندار فلم ہے جس میں سہگل اور کنن، نواب اور جگدیش نتن بوس کی ڈائریکشن میں کام کر رہے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ لگن کی دلچسپیاں توقعات سے کہیں بڑھ کر ہیں ہم امید کرتے ہیں کہ نیو تھیٹرز کے آخری فلم لگن کی عظیم الشان کامیابی موجودہ الجھنوں کو ختم کر دے گی۔

منروا مووی ٹون | "الٹی گنگا" نمائش کے لئے تیار ہو اب ڈائرکٹر سہراب مودی سکندر اعظم کی شوٹنگ میں مصروف ہیں سنا جاتا ہے وہ اسے پکار سے بھی بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ پرتھوی راج سکندر اعظم اور سہراب مودی راجہ پورس کا کردار پیش کر رہے ہیں۔ کہانی اور مکالمے مشہور افسانہ نویس پنڈت سدرشن نے لکھے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ فلم غیر معمولی قبولیت حاصل کرے گا۔

دی نظامِ شکر فیکٹری لمیٹڈ
بودھن
سرمایہ منظورہ :- ۳۵ لاکھ روپیہ سکہ عثمانیہ۔ سرمایہ اداشدہ :- ۳۵ لاکھ روپیہ سکہ عثمانیہ
معمولی حصص :- ۹۲ ہزار فی حصہ مالیتی ۲۵ روپیہ
ترجیحی حصص :- ۵ فی صد افزائش پذیر ۴۸ ہزار فی حصہ مالیتی ۲۵ روپیہ
نوٹ :- کمپنی نے امسال معمولی حصص پر ۶ فی صد اور ترجیحی پر تین سال کے لیے بشرح ۵ فی صد منافع تقسیم کیا ہے
ملکی سرمایہ محنت اور انتظام کے تحت نہایت صاف چمکدار اور خالص نیشکر سے بنی ہوئی
(شکر)
استعمال کیجیے اور ملکی صنعت کو فروغ دیجیے
(رجسٹر شدہ)
دفتر مسرت منزل۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

زندگی کے چند لمحے

از جناب ضیائی ایم اے عثمانیہ

نجمہ میری چچیری بہن تھی۔ پونا میں ہم دونوں ساتھ رہتے تھے مین ایم۔ اے کا طالب علم تھا اور وہ بی۔ اے میں تعلیم پا رہی تھی۔ میرا مضمون سیاسیات تھا اور اس کا فلسفہ اور شاید یہی وجہ تھی کہ اسکے مزاج میں قدرے سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔

ہم نے کئی سال ایک ہی شہر ایک ہی مکان اور ایک ہی محل میں گزارے تھے لیکن کبھی خیال بھی نہ ہوا تھا کہ مجھے اس سے یا اسے مجھ سے محبت ہے۔ وہ اگرچہ شعر نہ کہتی تھی لیکن اس نے شاعر کا دل ضرور پایا تھا اور خوشنما پھول دیکھکر، سریلی آواز سنکر یا کوئی لطیف خوشبو سونگھ کر دنیا و مافیہا کو بھول جاتی۔

اسکا دل نہایت حساس تھا اور بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا کہ اسے اپنے جذبات کی پامالی ہی میں لطف آتا ہے۔ حرف شکایت کبھی کسی نے اس کی زبان سے نہ سنا تھا۔ تکلیف اٹھانا اور اُف نہ کرنا بلکہ پیشانی پر بل نہ لانا اسکا شیوہ تھا۔ دوسروں کی تکلیف و پریشانی میں شریک ہونا لیکن اپنی انتہائی پریشانی اور تکلیف کا اس لیے پتہ بھی نہ چلنے دینا کہ شائد دوسروں کو تکلیف ہو اسکی خصوصیت تھی۔ اسکی مسرتیں کیا تھیں کسی کو معلوم نہ تھا لیکن بعض اوقات وہ بہت مسرور نظر آتی اور اس وقت وہ ہر ایک کو اپنی مسرت میں شریک کرنے کی کوشش کرتی۔

ہم لوگ یونہی زندگی گزار رہے تھے، خاموش، دوستوں کی طرح۔ دل نے سمندر پر چاندنے ابھی ضیاباری نہ کی تھی اسلئے زندگی کی کشتی بآسانی اطمینان کے بادبان اڑائے چلی جا رہی تھی۔

مارچ کی آخری تاریخیں تھیں۔ امتحانات ختم ہو چکے تھے اور کالج بند ہو گیا تھا یکایک وہ بیمار پڑی۔ ڈاکٹروں نے میعادی بخار بتایا۔ مین دن کا اکثر حصہ اسی کے پاس بیٹھکر گزارتا اور اسکا دل بہلانے کے لیے دلکش افسانے اور ناولیں سناتا۔ وہ خاموش سنتی رہتی اور بہت کم بات کرتی۔ اسی زمانے میں میرے بڑے ماموں سخت بیمار ہو گئے اور مجھے بمبئی جانا پڑا لیکن وہاں پہنچکر مجھے اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ نجمہ کی صورت اکثر آنکھوں کے سامنے رہنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک فلم دکھائی جا رہی ہے جس میں صرف ایک ہی کردار ہے جو ہر پارٹ ادا کرتا ہے۔ اس کا خیال

میرے دل و دماغ پر مستولی ہو چکا تھا۔ اسے متین اور سنجیدہ پاکر میں بھی سنجیدہ اور خاموش ہو جاتا اور متبسم اور مسرور دیکھ کر میرا دل بھی مسکرانے لگتا۔ سوتا تو اسکے خواب دیکھتا اور جاگتا تو اسکا تصور کسی دوسری دنیا میں پہنچا دیتا۔ بعض اوقات ہجوم افکار سے گھبرا کر یکسوی تلاش کرتا اور سوچتا کہ مجھ میں کوئی وصف نہیں کہ نجمہ مجھے التفات بھری نظروں سے دیکھ سکے۔ دولتمند ہوتا تو اسکے اشارے پر ہر چیز حاضر کرتا۔ ادیب ہوتا تو اپنے بہترین ناول کی ہیروئن بناتا۔ مصور ہوتا تو ایک مرقع بناتا جسمیں صرف اسی کی تصویریں ہوتیں۔ شاعر ہوتا تو حسین وجمیل نظمیں لکھتا اور اگر مغنی ہوتا تو اس کے حسن کے گیت گاتا۔
اس وقت میں محسوس کرتا کہ قدرت نے میرے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے میرے دل میں اس کے خلاف ایک شدید جذبۂ بغاوت بیدار ہو جاتا اور میرا جی چاہتا کہ اس سے انتقام لوں لیکن ایسے وقت میں نجمہ کی صورت میرے سامنے آجاتی، سنجیدہ اور نیم متبسم۔ اب میرے دل میں صرف ایک جذبہ ہوتا اور وہ جذبۂ عبودیت تھا۔
میرے دل سے محبت کی چند حسین وجمیل خنک شعاعیں نکل کر نجمہ کے چہرے کے گرد ایک ہالہ بنا دیتیں۔ اس ہالے سے کہیں زیادہ دلکش جو مصور کسی مافوق الانسان ہستی کی شبیہ کے گرد بنایا کرتے ہیں۔

میرے ماموں کچھ عرصہ بعد اچھے ہو گئے اور میں پونا واپس آگیا ہمارا مکان شہر کے مغربی سرے پر تھا، وسیع وکشادہ گھر میں کل چھ سات رہنے والے تھے۔ صحن میں کئی درخت تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر نجمہ نے عشق پیچاں اور گلاس کی بیلیں چڑھا کر دیسی اور ولایتی گملوں کو نفاست سے ترتیب دے کر نہایت دلکش بنا دیا تھا۔ ہم لوگ شام کو قریب ہی تھوڑی دور ایک پہاڑی کے دامن کی طرف سیر کرنے جاتے، کتابیں پڑھتے، سیاسی اور معاشری مسائل پر بعض اوقات گرما گرم بحثیں کرتے یا کبھی کبھار کسی دوست کی فرمائش پر سینما چلے جاتے کیونکہ سینما سے نہ تو نجمہ کو زیادہ دلچسپی تھی نہ مجھکو۔
بمبئی سے واپس آنے کے بعد مجھے اپنے آپ میں ایک تغیر محسوس ہونے لگا۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے بحث کے دوران میں محسوس کیا کہ میں اپنی رائے پر نجمہ کی رائے کو ترجیح دینے لگا ہوں اور اکثر اوقات اس کے استدلال میں گم ہو کر اپنی شکست تسلیم کر لیتا ہوں۔ وہ اب بھی حسب سابق آتی اس طرح جیسے بوئے گل یا معصوم بچوں کی آنکھوں میں نیند۔ وہ آتی اور ایک شیریں سریلی آواز میں جو معصومیت، خلوص اور سادگی سے معمور ہوتی، خود اعتمادی کے لہجہ میں اندر آنے کی اجازت مانگتی۔ میں ہمہ تن شوق ہو جاتا اور اس خلوص سے بلاتا جو صرف بچوں میں ہوتا ہے۔

تعطیلیں یونہی سیر و تفریح، مطالعہ اور وقتی مسائل پر بحث کرنے میں گزر گئیں۔ گرمی اور برسات گزر کر گلابی جاڑے شروع ہوئے۔ ایک روز میں وہ اور چند عزیز سیر کرنے جا رہے تھے۔ شام کا وقت تھا سامنے سے ایک موٹر نہایت تیزی سے آئی۔ ڈرائیور نے بچانے کی کوشش کی لیکن ٹکر ہوئی اور سخت۔ ہم سب کو چوٹیں لگیں لیکن نجمہ بیہوش ہو گئی ہماری مسرت پریشانی اور افسردگی سے بدل گئی۔ نجمہ کے والد ڈاکٹر تھے اور اتفاق سے گھر پر دو تین اور ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ اس کے سر میں زیادہ چوٹ لگی تھی اس لئے ڈریسنگ کر کے اسی کے کمرے میں لٹا دیا گیا۔

ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ حادثہ کچھ زیادہ خطرناک نہیں لیکن نہ جانے کیوں مجھے بہت پریشانی تھی مین بار بار دبے پاؤں اسکے کمرے میں جاکر دیکھ آتا کہ ہوشیار ہوئی یا غافل ہے۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد نرس نے کسی کام سے تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا چاہا اور مجھ سے کمرے میں ٹھیرنے کو کہا۔

مین دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔ اسکے بال شانوں پر بکھرے اور پیشانی پر ایک سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بجلی کی روشنی اسکے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ قدیم زمانے کی ایک حسین شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔ مین نے اس کی طرف دیکھا تو وہ آنکھیں کھولے ٹکٹکی باندھے چھت کی جانب دیکھ رہی تھی مجھے دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کہ ایک مضمحل مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر بیدار ہوئی اور اس نے مجھ سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ مین نے اسکی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ جل رہی تھی۔ اُسے سخت بخار تھا۔ مین قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گیا لیکن میری زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ مین اسے دیکھتا رہا۔ یکایک اسکی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہوئی۔ اُس نے میرا ہاتھ اٹھا کر نرمی سے دبایا اور اپنے سینہ پر رکھ لیا۔ اسکا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ مین اپنے وجود سے بیگانہ ہو گیا اور مجھ پر ایک بیخودی کا سا عالم طاری ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک حسین و دلکش باغ میں ٹہل رہا ہوں سامعہ نواز پرندے حیات افروز نغمات سے روح کو سرور اور بالیدگی بخش رہے تھے۔ خنک اور لطیف عطر میں ڈوبی ہوئی ہوائیں مشام جان کو معطر کر رہی تھیں۔ میرے دل میں زندگی کی ایک لہر سی پیدا ہوئی اور میرے دماغ میں زندہ رہنے کا جذبہ ایک برقی رو کی طرح دوڑنے لگا۔

اسکی آنکھیں محبت کی دو مخمور دنیائیں تھیں جنھوں نے ساری فضا کو محبت سے معمور کر دیا تھا۔ میرا دل ایک ناقابل بیان مسرت محسوس کر کے ایک دلکش نغمہ گا رہا تھا۔ اسوقت مجھے معلوم ہوا کہ انسان کی زندگی درحقیقت انہی چند لمحات مسرت کا نام ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں لیکن یہی وہ لمحات ہیں جنھیں انسان خوشی سے جان دے سکتا ہے۔

طریقۂ اظہار

از جناب لطیف احمد صاحب علوی

اس باب کا عنوان "فلمی حدود" بھی رکھا جا سکتا ہے، لیکن میرے خیال میں طریقہ اظہار زیادہ مناسب ہے۔ مین خوب خوب جانتا ہوں کہ اکثر اشخاص "فلمی حدود" کو زیادہ وسیع نہیں سمجھتے لیکن میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے، کسی افسانہ کو لفظ بہ لفظ صداقت کے ساتھ پردۂ فلم پر پیش کر دینے سے کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ بسا اوقات اسی پر عمل کرکے ایک حد درجہ برا فلم بھی پیش کر دیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسکی وجہ فلمی حدود ہے اس سوال کا جواب اور صحیح جواب صرف یہی ہے کہ اس کا باعث فلمی حدود نہیں بلکہ ناظرین کی فہم کی تنگی ہے۔

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے اصل یہ ہے کہ گزشتہ خیالات کے اعادہ اور میکانیکی عناصر کی آمیزش نے فلموں کو محدود کر دیا ہے تاہم اگر فلم پیش کرنے والے چاہیں تو وہ اس کو بڑی حد تک کم کر سکتے ہیں اور اس کا طریقہ (Scientific Handing) ہے۔ ہر فلم ساز کو اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے ناظرین پر فلم کے "میکانیکی" عناصر سے، نفسیاتی تاثرات ڈالتا رہے۔

اس موضوع کی گہرائیوں تک پہنچنے اور اپنے دماغ پر غیر معمولی بوجھ ڈال کر اسے چھوٹے چھوٹے اجزا میں منقسم کئے بغیر انسانی دماغ کو ایک بڑا منضبط اور زود اثر عنصر کہہ سکتا ہے یہ عنصر ایسا ہے، جس کی نشو نما حواس خمسہ سے ہوتی ہے اور اسی کی جدوجہد اور ترتیب کا نتیجہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ دماغ کی نشو نما کیونکر ہوتی ہے اور اس کا طریقہ کیا ہے، سو یہ ایک ایسا سوال ہے، جسپر ہم کو کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کو وہی اشخاص بخوبی بیان کر سکتے ہیں جنہوں نے اس سعی میں عمریں گزار دی ہیں۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ حواس پانچ قسم کے ہوتے ہیں، جن کا تعلق اعصاب (Nerves) سے ہوتا ہے یہ اعصاب دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک حسی Sensory اور دوسرا حرکی Motory ان کی تشریح کرنا بظاہر بیکار ہے لیکن غلط فہمی سے بچنے کے لیے مجھے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مین اُن کی فلمی حد تک وضاحت کر دوں۔

حسی۔ (Sensory) وہ اعصاب ہیں جو کسی احساس کو دماغ تک پہنچاتی ہیں۔ حرکی ( ) وہ اعصاب ہیں جن کے ذریعہ سے دماغ اپنا فعل انجام دیتا ہے مثلاً جب ایک شخص کا ہاتھ کسی گرم چیز سے

چھوجاتا ہے تو حسی اعصاب Sensory Nerves دماغ کو اس خطرہ سے آگاہ کر دیتے ہیں اور دماغ حرکی اعصاب کے ذریعہ ہاتھ ہٹا لیتا ہے گویا حرکی اعصاب انسان کے عضلات اور پٹھوں پر اقتدار رکھتے ہیں ہر شخص یہ جانتا ہے کہ کسی خیال کو دماغ تک پہنچنے میں اور پھر اسے عملی صورت اختیار کرنے میں صرف ایک لمحہ ہی درکار ہے، لیکن یہ عمل بھی غور و شمار کرنے کے قابل ہے اور اس کو طبی اصطلاح میں Reflexaction حرکت معکوس کہتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مختلف انسانوں کی قوت منعکسہ مختلف ہوتی ہے اور اس کی اصل وجہ، دماغ کی سست روی اور حواسوں کی پریشانی ہے۔

مین نے جو مثال بیان کی ہے اس کا تعلق چھونے سے ہے اور یہ پانچ حواسوں میں سے صرف ایک ہے، لیکن دوسری مثالیں بھی پیش کرنا کچھ دشوار نہیں ہے چنانچہ اس قسم کی تمام مثالیں حرکت معکوس کی ابتدائی نظریں کہی جاسکتی ہیں، حرکت معکوس بھی ہمارے دماغوں پر بڑی تیزی سے اثر کرتی ہے۔ بڑے بڑے سانحات کے مواقع پر باکمال طبیب اس کا اندازہ کرسکتے ہیں اس تجربہ میں جو طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو نفسیاتی تحلیل کہتے ہیں۔ اس میں طبیب مریض سے سوالات کرتا ہے۔ سوال کے اثرات کے انعکاس کی وسعت کا اندازہ کرکے وہ مریض کے خطرات اور مرض کی نوعیت کا اندازہ کرلیتا ہے۔ صاف طور پر اگر اسی بات کی وضاحت کی جائے تو اس کا یہ مقصد ہوگا کہ عکس ڈالنے والے فعل کا اثر دماغوں پر ہوتا ہے۔ اس بات کا خیال رکھکر ہم اپنی توجہ کو وسعت دے سکتے ہیں۔

عمل انعکاس، حواسوں کا تابع ہوتا ہے، اس کو ناپ بھی سکتے ہیں۔ انسانی طبائع کی مناسبت سے اس میں فرق بھی ہوتا ہے، عمل انعکاس پر غور کرنے سے ہم اس بات کا اندازہ کرسکتے ہیں، جس نے انسان کے دماغ پر اور اس کے خیالات پر اپنا اثر جما لیا ہے اس لئے ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انسان کا دماغ بعض اوقات ایسا متاثر ہوتا ہے کہ وہ بعض خیالات اور اثرات کو ظاہر نہیں کرسکتا، جو اسے عموماً اس وقت ظاہر کرنا چاہیے تھے جب اسے روحی غذا مل رہی تھی اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ خیالات ہم تک باقاعدگی کے ساتھ نہیں پہنچتے۔ جس طرح کہ ایک قصے کی جاذبیت انسان کے دماغ پر اثر کرنے کے لئے مصنف کی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم کو ان خیالات کی پیدائش کو روکنا چاہیے جو اثرات کو ناکام کر دیتے ہیں۔ ان کو روکنے کا صرف یہ ذریعہ ہے کہ انسان ان اثرات سے پورا فائدہ اٹھائے جن سے دماغ کو غذا مل رہی ہے۔

اس سے قبل میں کہہ چکا ہوں کہ فلم کی سب سے بڑی حدبندی یہ ہے کہ اثرات انعکاسی کو غائب

کر دیا جائے۔ فلم میں جہاں تک کہ اسکی مادی حالت کو دخل ہے یعنی وہ رفتار جس سے کہ فلم کی نمایش کی جارہی، ہم صرف ان عام اثرات انعکاسی سے تعلق رکھ سکتے ہیں جو ہمارے دماغ میں پیدا ہو رہے ہیں۔ اس صورت میں کہ فلم کی زبان عام فہم اور عوام کی زبان ہو، ہر شخص خواہ وہ کسی ذہنیت کا کیوں نہ ہو اس سے لطف اٹھا سکتا ہے اس بارے میں عوام کے دماغوں کی عمل انعکاسی ہی سے ہم فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اگر ہم اس سے بالکل قطع نظر کرلیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تیز فہم انسان (جن کے دماغوں کی شعاع انعکاسی چھوٹی ہوتی ہے) اس افسانہ میں کمی محسوس کریگا اور سست فہم (جن کے دماغوں کی شعاع انعکاسی بڑی ہوتی ہے) اس پر متعجب ہوگا۔ یہی مسئلہ افسانے کے پیش کرنے والے کے لئے بہت اہم ہے۔ افسانہ پیش کرنے والا اگر چاہے تو وہ اس اہم مسئلہ کو گھٹا سکتا ہے، لیکن یہ ایک محدود جماعت کے لیے حدود قایم کر دینا ہے فلم کے لیے نہیں ——— !

واقعی یہ بہت ہی اہم صورت ہے۔ مین پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ دماغ کی انعکاسی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ان حواسوں کو تیز کرنا پڑتا ہے جو دماغ کو غذا پہنچاتے رہتے ہیں۔ ایک اور مسئلہ فلم پیش کرنے والے کے لئے بہت ضروری ہے اور یہ معاملہ فلم اور ناظرین، دونوں کی حدبندی کر دیتا ہے۔ میرا مقصد اس سے متحرک تصاویر" کی ابتدا سے ہے، جسے Constancy of vision استقلال نظر کہتے ہیں یہی متحرک تصاویر کا ابتدائی اصول ہے، اگر اس مسئلے کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس سے دماغی قوت انعکاسی کی افزایش میں بڑی کمی ہو جاتی ہے، برخلاف اس کے اگر اس کو اچھی طرح استعمال کیا جائے تو اس سے بہت امداد ملتی ہے، تسلسل میں بھی اس کا بہت اثر ہوتا ہے، جس کا ذکر کہیں اور کیا گیا ہے۔

اب مین انعطاف (Retrospection) پر توجہ دلانا چاہتا ہوں، مین یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ کونسا فعل ہے دراصل (Retrospection) انعطاف کے یہ معنی ہیں کہ کسی چیز کو مختلف زاویوں سے دکھانا، یعنی پیچھے "دیکھنا" چھوٹے واقعات میں اسے عکاسی کہتے ہیں، لیکن بڑے اور اہم واقعات میں اسے دماغ کی اس نامعلوم قوت سے، دماغ کی ظاہری طاقت کی امداد کرنا کہتے ہیں جس سے انسان نتائج قایم کر سکتا ہے، ایک فلم پیش کرنے والا اگر اس مسئلے پر مناسب توجہ کرے تو وہ انسانی دماغ کی قوت انعکاس کو زیادہ حساس بنا سکتا ہے، یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ پرانے ناٹکی ڈرامہ نگاروں نے اس کو تنہائی کی گفتگو سے پورا کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ پرانا طریقہ تھا، لیکن مقصد اس کا وہی ہے جو مسطور بالا میں عرض کیا گیا ہے۔

ایک شخص جو کسی کتاب کو پڑھتا ہے، خود بخود کہیں کہیں رک جاتا ہے اور یہاں پر وقفہ انعکاسی دماغ"

بالکل نامعلوم ہوتا ہے، ایک ناٹک کا اداکار جب اسٹیج پر گفتگو کرنا سیکھتا ہے تو وہ اس طرح الفاظ ادا کرتا ہے کہ ان سے اثرات انعکاسی پیدا ہوں اور اس طرح سے اس کی گفتگو پُرلطف ہو جائے۔ لیکن فلم ایسا نہیں کرتی بلکہ وہ دماغ کو دانستہ یا نادانستہ طریقہ پر ایک فٹ فی سکنڈ (یا اس سے زیادہ) کی ہموار رفتار پر اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض بڑے بڑے مصنفوں کے افسانے پردۂ فلم پر آکر ناکام ثابت ہو جاتے ہیں، چونکہ انہوں نے قوت انعکاسی پر غور نہیں کیا تھا، اس وجہ سے انکی تجاویز ختم ہو جاتی ہیں، سوسائٹیاں قایم ہوتی ہیں، شکسپیر کے قدرداں مختلف گروہ بنا لیتے ہیں، لیکن وہ کامیابی نصیب نہیں ہوتی جس کو حقیقی کامیابی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ دماغ کی "لہروں" کو وہ اس طرح قایم نہیں کرتے جس طرح شکسپیر نے قایم کیا تھا، ورنہ کیا وجہ ہے کہ دو بڑے اداکار "ہملیٹ" کے ایک کھیل کو دو مختلف طریقوں پر ادا کرتے ہیں ؟

اب ہم فلم کے آخری اور سب سے اہم نکتے پر گفتگو کریں گے، وہ یہ ہے کہ فلم دیکھتے وقت صرف ایک قوت کو یعنی بصارت یا بینائی، کو صرف کیا جاتا ہے، مکالمہ، ہندوستانی فلموں میں عموماً غلط لہجہ سے ادا کیا جاتا ہے اسلئے دماغی لہریں صحیح راستہ نہیں اختیار کرتیں اور اس طرح اثرات میں وقفہ پڑ جاتا ہے ——————
میں اتفاقاً آجانے والی موسیقی کو اس میں شامل نہیں کرتا، نغمات کو اگر باقاعدہ نغمیاتی اصول کے تحت استعمال کیا جائے تو وہ، دماغ پر ایسے اثرات پیدا کر سکتا ہے جو انتشار کو کم کر دے —————— اس سلسلے میں ہم کو مجبوراً، پھر علماء سائنس کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ متفقہ طور پر یہ کہتے ہیں کہ جب ایک قوت کم ہو جاتی ہے تو دوسری قوتیں اپنے تناسب سے بڑھ جاتی ہیں یا ان کو ترقی کا موقع ملتا ہے ——————
میرے خیال میں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دماغ پر اثر کرنے والی غذا پہنچانے کے لئے ہم کو ایک کلیہ قایم کر لینا چاہئے۔ فلم میں ہم کو یہ فائدہ کہ ہم دو قوتیں استعمال کر رہے ہیں، اس لیے ہر دو کو متناسب ہونا چاہیے، ورنہ دماغ کو کافی اور متناسب غذا نہیں پہنچ سکے گی میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ بہت سی ہندوستانی فلموں میں اس تناسب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا؟ حسب ذیل مقامات کو دیکھئے اور دماغ کو غذا پہونچانے والی طاقتوں کا اندازہ لگایئے۔

کھلے میدان میں موسم بہار کی ایک صبح، جب کہ چڑیاں چہچہا رہی ہوں دماغ کو بصیرت، سماعت، احساس سب قوتیں پہونچاتی ہیں؟ یہاں انعکاسی پیدا ہوتی ہے۔

ایک کھیل دیکھکر قوت بصارت اور سماعت، اثر پذیر ہوتی ہیں اور انعکاسی پیدا ہوتی ہے۔ کسی نغمہ کو سُن کر قوت سماعت انعکاسی پیدا کرتی ہے ایک تصویر کو دیکھکر قوت بصارت انعکاسی پیدا کرتی ہے۔

ایک کتاب کو دیکھکر بھی قوت بصر، انعکاسی پیدا کرتی ہے ——— لیکن ایک فلم کو دیکھکر انسان صرف اپنی بصیرت اور سماعت سے خفیف سی انعکاسی کو کام میں لا سکتا ہے۔ عنوانوں میں بھی تھوڑا بہت انعکاسی کو دخل ممکن ہے تاہم ان امور کے باوجود بھی، مصنف اور مرکالمہ نگار، ادا آموز اور عکاس ان مشکلات میں سے اکثر کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اس میں کامیاب ہونے کے لیے مُصنّف اور فلم ساز، کو ایک دوسرے سے ہر وقت تعاون کرنا چاہیے۔

سینما گھروں کی بے عنوانیاں

از جناب ستیش چندر طالب بی۔اے (دہلوی)

سینما گھروں کی بدعنوانیوں کے متعلق جناب ستیش چندر صاحب طالب
دہلوی بی۔اے۔ نے ایک نہایت بصیرت افروز مضمون لکھا ہے۔
جسے ہم موقر معاصر دین و دنیا کے شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔
جناب طالب نے اپنے مضمون میں جن امور کا ذکر فرمایا ہے۔
وہ نہ صرف پبلک، مالکان سینما، بلکہ حکومت کی بھی خاص توجہ کے محتاج ہیں۔
اگر یہ تمام خرابیاں دور کردی جائیں تو پبلک صحیح معنوں میں سینما سے
مستفید ہو سکے گی۔ (مدیر)

یہ مشاہدہ عام ہے کہ سینما ہال کھچا کھچ بھر چکا ہے۔ کہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ اسپر بھی ٹکٹ برابر جاری رہتے ہیں۔ اور وہ ریل پیل ہو رہی ہے کہ الاماں والحفیظ منتظمین کو اپنی کارگزاری کی نمایش مقصود ہے۔ اور مالکان کو اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ غریب پبلک کی تکالیف کا احساس کسے ہے۔ اور ہو بھی کیوں؟ مثل مشہور ہے کہ "بن روئے ماں بھی بچہ کو دودھ نہیں دیتی"۔ جب تک عوام خود اپنے بیدار، متحد اور منظم ہونے کا کافی و شافی ثبوت نہ دیں اس ضمن میں ہنوز روز اول والا معاملہ ہی رہے گا۔

اس پر ہی بس نہیں۔ یہ سلسلہ تماشہ شروع ہونے کے بعد میں بھی جاری رہتا ہے۔ سینما حال میں تو تاریکی ہوتی ہے۔ اسلیے ان نوواردوں کو مثل اندھوں کے اپنے لیے جگہ ٹٹول ٹٹول کر تلاش کرنا ہوتی ہے۔ کوئی صاحب غلطی سے کسی دوسرے صاحب کے اوپر سوار ہو جاتے ہیں۔ اسپر جو بم چیخ مچتی ہے اس کا اظہار قلم سے ممکن نہیں۔

اندرون حالات تماشہ آغاز ہو جانے کے کم از کم پندرہ منٹ بعد تک تو اطمینان کا سانس لینا نصیب نہیں ہوتا۔ پلاٹ وغیرہ کیا خاک سمجھ میں آئے۔

آخر مسافر بروقت ریلوے اسٹیشن پر بھی تو پہنچ ہی جاتے ہیں اور ریل چھوٹنے کے وقت مقررہ سے پہلے اپنا اسباب اور اپنے لیے جگہ نکال لیتے ہیں۔ یہ کیوں؟ محض اس لیے کہ انھیں اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ ریل ان کا انتظار کیے بغیر وقت مقررہ پر چھوٹ جائے گی۔ اگر تاخیر سے پہنچنے والوں پر سینما کے دروازے بھی

بند کر دیئے جائیں تو شروع شروع میں چاہے مالکان کو تھوڑا بہت خسارہ رہے لیکن انجام کار پبلک میں مستعدی و باقاعدگی پیدا ہو جائے گی اور جو زندہ اقوام کا حصہ ہے۔ اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ آخری نتیجہ کے طور پر مالکان سینما ٹوٹے میں نہ رہیں گے۔

یہ بھی اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ چند مخصوص افراد پر مشتمل ایک گروہ پہلے ہی سے ٹکٹ گھروں پر قابض ہو جاتا ہے۔ اور ایک دم پچاس۔ سو یا اس سے زائد ٹکٹ خرید لیتا ہے اور پھر انہیں زیادہ قیمت پر فروخت کرتا۔ اور پھر ہنگامہ اور طوفان برپا ہوتا ہے کہ بس خدا کی پناہ۔ پبلک بڑے حد تک مجبور ہوتی ہے کہ زائد دام دے۔ کیونکہ کھڑکیوں تک جانا اور ٹکٹ حاصل کرنا بلا مبالغہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہی ہے کہ اس میں ٹکٹ فروخت کرنے والے کلرکوں کا کمیشن ہوتا ہے۔ اور یہ لالچ اس جملہ افراتفری کا باعث ہوتا ہے۔ بالخصوص ان افراد کی حالت حد درجہ قابل عبرت ہوتی ہے۔ جن کے ہمراہ پردہ نشین مستورات اور بچے ہوتے ہیں۔ تماشائی ہونے سے پیشتر وہ فوراً تماشا بنے ہوئے نظر آتے ہیں اور گویہ تماشا ہونے والے تماشے سے زیادہ جاذبِ نگاہ و دلچسپ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جیسا میں نے عرض کیا عبرت انگیز بھی۔

کیوں صاحبو! کیا یہ حالات آپ کی توجہ کے مستحق یا قابل اصلاح نہیں؟ آپ فرمائیں گے کہ ان خرابیوں کے انسداد کے لیے قانون ہے۔ قانون کی ہستی سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن شکایت البتہ ہے اور وہ یہ کہ جس باقاعدگی اور سرگرمی کے ساتھ مجوزہ قانون کا نفاذ کیا جانا چاہئے۔ وہ نہیں ہوتا۔ اگر ایک مہینہ میں دو چار چالان بھی پیش ہو جایا کریں۔ اور سزائیں ہو جائیں تو دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حالات قطعاً ناپید ہو جائیں۔

یہ تجربہ بھی سینما جانے والوں کے لیے کچھ نیا نہیں کہ تماشہ معینہ وقت سے بہت بعد کو شروع ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں تماشائیوں میں سے کثیر تعداد غیر مقامی اشخاص کی ہوتی ہے، وہ تفریحاً دو ڈھائی گھنٹے سینماؤں میں گزارتے ہیں۔ اور پھر اپنے اپنے شہروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔ مقررہ وقت پر تماشہ شروع نہ ہونے کا خمیازہ سب سے زیادہ انہیں برداشت کرنا پڑتا ہے ظاہر ہے کہ جب تماشہ دیر سے شروع ہوگا تو دیر میں ہی ختم ہوگا۔ اس تاخیر کے باعث طے شدہ پروگرام گڑبڑ ہو جاتے ہیں۔ اور ریل نکل جانے سے مسافروں کو جن ناگفتہ بہ مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ کچھ اُن کا دل ہی بہتر جانتا ہے۔ اس لیے وہ آئندہ ایسی تفریحات سے توبہ کر لیتے ہیں۔ منتظمین و مالکان سینما کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ کیا ایسا ہونے کے باعث اُنھیں نقصان نہیں پہنچتا۔

پھر اُس دوران میں بھی جبکہ تماشہ دکھایا جا رہا ہو، سودے والے دخل اور معقول ہوتے ہیں۔ آخر وقفہ کس لیے ہوتا ہے محض اسلئے کہ تماشائی اپنی جملہ ضروریات سے فارغ ہولیں۔ بالفرض اگر وقفہ کم ہے تو اس میں توسیع کی گنجائش پیدا کی جانی چاہیے، لیکن اُس ذہنی اذیت کو جو ان خوانچہ والوں کے ہاتھوں اس اثنا میں جبکہ تماشہ دکھایا جا رہا ہو پبلک کو پہنچتی ہے کسی طرح بھی حق بجانب قرار نہیں دیا جاتا۔

پھر یہ کیا ضروری ہے کہ اگر سودا فروخت کیا جائے تو ایک صدائے بے ہنگام کے ساتھ سودا بیچنا ہے یا صور پھونکنا۔ اس پر بس نہیں تماشائیوں سے یہ بھی تقاضہ ہے کہ وہ صفوں کے درمیان سے ان خوانچہ والوں کو گزرنے دیں۔ ایسے موقعوں پر اگر مزاحمت کی جاتی ہے تو شور و غل چیخ پکار کے باعث تماشے کا لطف بالکل مٹی ہو جاتا ہے۔ خوانچہ والے بضد ہیں کہ ہم صفوں کے درمیان سے گزریں گے۔ اور تماشائیوں کا اصرار ہے۔ کہ یہ ناممکن ہے اس چپقلش کے درمیان اکثر گالی گلوچ حتیٰ کہ فوجداری کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ ان شرمناک حالات کا تدارک ازبس ضروری ہے اور ہر اس طبع کو جسے غور و فکر کی صلاحیت ودیعت ہوئی ہے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان حالات کو بہتر بنانے کے لیے بھی امکان بھر سعی کرے۔

دوران تماشے میں بچوں کا کلبلانا اور رونا اور پھر چپ کرانے پر بھی چپ نہ ہونا حد درجہ سوہان روح ہوتا ہے۔ بسا اوقات بجائے اس کے کہ آپ اداکاران فلم کے کمال کی داد دیں۔ آپ ان معصوم فتنوں کی گلے بازی کی داد دینے پر مجبور ہوتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان کا ہمراہ لانا کیوں ضروری ہے؟ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ یہ فلم سے محظوظ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگر یہ کہیے کہ یہ ماں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تو پھر ان ماؤں کا بھی سینما دیکھنا کونسا حکیم جی کا نسخہ ہے۔ جس کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن یہاں تو محض اپنی عشرت مطلوب ہے۔ دوسرے کی تکلیف کا کوئی احساس نہیں۔ اگر کہیں یہ پیدا ہو جائے تو ہماری اجتماعی زندگی بہت کچھ سنبھل نہ جائے۔ لیکن یہ ہو تو کیونکر؟ یہ تو آزاد اور بیدار قوم کا حصہ ہے۔

خیر بچے تو معصوم اور بے سمجھ کہہ کر چھوڑ دیے جائیں گے لیکن ان باسمجھ پیر نا بالغان کو کیا کہیے گا جن کا شعار ہے کہ دوران تماشہ میں اس کے معائب و محاسن پر تنقید فرمائیں۔ اور وہ بھی مسلسل اور بلند آواز میں۔

اس ضمن میں تین چار آنے والوں کی بدذوقی اور فرعونیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ہاتھوں اکثر اہل ذوق کی سماعت مجروح ہوتی رہتی ہے۔ اس کی ذمہ داری محض اُن پر یا سینما والوں پر عائد نہیں کی جا سکتی بلکہ ہمارے ملکی، معاشرتی، تمدنی، اقتصادی، سیاسی اور تعلیمی ماحول پر بھی بہت کچھ تائید ہوتی ہے۔

صحت عامہ کے محافظین جو مقامی میونسپلٹیوں سے وابستہ ہیں۔ اس ضمن میں انہیں بھی اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی چاہیے بعض سینما گھر فی الواقع ایسی ردی حالت میں ہیں کہ اصولاً وہاں تصویر کا دکھایا جانا ممنوع قرار دیا جانا چاہیے۔

ہندوستان کی بین القومی زبان

اردو سے فلمسازوں کا تعصب

از جناب رضی الرحمن صاحب " ادارہ ملیہ "

گزشتہ ماہ کے " فلم " میں عبدالواحد صاحب کا مضمون جو سینمائی زبان کی خامیوں کے متعلق تھا پڑھ کر پُرانے زخم ہرے ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ چیز اب بُری طرح محسوس ہو رہی ہے کہ فلمساز فرقہ واریت کی لعنت میں اس طرح مبتلا ہو گئے ہیں کہ وہ اب ہر اُس بات سے جس کا کچھ بھی تعلق مسلمانوں سے ہو گریز کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ ہر نیا فلم جو تیار ہوتا ہے اسی لعنت کا ایک نیا ثبوت پیش کرتا ہے اور فلمسازوں کی مسلم دشمنی پر مُہر تصدیق ثبت کرتا ہے آئے دن فلمی زبان کی اصلاح کے لیے مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں لیکن فلم ساز پبلک جذبات سے یا تو بالکل لاعلم رہتے ہیں یا انجان بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال کب تک ؟ کیا اب بھی پبلک جذبات سے کھیلا جائے گا۔ ؟

بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ آخری بار اس چیز پر متوجہ کیا جائے ورنہ نتائج کی ساری ذمہ داری انہیں کے سر ہوگی۔

اس سلسلے میں مجھے امید تھی کہ ملکی اخبارات اس مسئلہ پر توجہ کریں گے لیکن وہ یوں ممکن نہیں کہ انہیں اشتہارات ملنا بند ہو جائیں گے۔ اشتہارات .... جن پر اخبار کی بقاء و کامیابی کا دار و مدار ہے۔ مگر آپ کا موقر رسالہ " فلم " تو ایسے اشتہارات سے پاک نظر آتا ہے۔ اور آپ پر تو اس قسم کی کوئی ذمہ داری عاید نہیں اسکے علاوہ آپ کے رسالہ کی پالیسی جہاں تک میرا خیال ہے ابتدا میں ترکِ سینما اور بعد میں مصلحتاً اصلاح سینما رہی ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ اس اہم ترین مسئلہ پر آپ اتنی توجہ نہیں کر رہے ہیں جتنی کہ کرنی چاہیے سینما کی اس سب سے بڑی خامی کی اصلاح پر سب سے پہلے آپ کو توجہ کرنا چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ اگر آپ فلم سازوں اور فلم بینوں کو ان کے فرائض یاد دلاتے رہیں۔ تو بہت

بڑی قومی اور فلمی خدمت ہوگی۔

سینما اب ہماری معاشرت کا ایک اہم جزو بن گیا ہے اس سے چھٹکارا پانا اب تقریباً ناممکن سا معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن اس صنعت کو آسایش بخش اور مفید بنانا تو ہمارے امکان میں ہے۔ اور وہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ زبان ایسی اختیار کی جائے جو ہندوستان جیسے ملک کے مختلف النسل باشندوں کی سمجھ میں آسکے بقول رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کہ وہ صرف اُردو ہی ہوسکتی ہے چنانچہ موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ "اُردو ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے۔"
برخلاف اسکے ایسی زبان جو آج کل فلموں میں استعمال ہوتی ہے اچھی طرح یاد ہے کہ حال میں نشاط سینما میں مجھے 'نرسی بھگت' نامی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اُس میں جو زبان استعمال کی گئی تھی اس کے اکثر فقرے میری سمجھ میں تو کیا آتے۔ میرے آس پاس بیٹھے ہوئے اکثر ہندو بھائیوں کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔ میں نے دیکھا وہ لوگ پہلو بدل بدل کر ایک دوسرے سے اس کا مطلب پوچھ رہے ہیں لیکن جن سے پوچھا جاتا ہے وہ بیچارے خود ناواقف تھے اس لیے سر ہلا کر چپ ہو رہتے۔

اس کے برعکس بھروسہ نامی فلم جو اس سے پہلے اسی سینما میں آچکا تھا خالص اُردو زبان میں تھا اس لیے ہر شخص اس سے خاطر خواہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اور اسکی یہی ایک ایسی خصوصیت تھی جس کے باعث وہ ہفتوں کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔

ایک چیز اور ہے جو اپنی جگہ پر بے حد اہم ہے' یہ کہ جیسا کہ اس سے پیشتر سید الماجد صاحب نے بتلایا ہے اداکاروں کے نام وغیرہ انگریزی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ جس کو شاید ۱۰ فیصد سینما بین حضرات جانتے ہوں گے بقیہ لوگ ناموں سے قطعی ناواقف رہتے ہیں وہ بیچارے۔ پہلے ہی سے اس بارے میں واقفیت حاصل کر لیتے ہیں یا بعد میں معلوم کر لیتے ہیں مختصر یہ کہ صاف طور پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ فلم ہندوستانیوں کے لئے یقیناً نہیں تیار کئے جاتے۔ یہ چیز اتنی مہمل ہے کہ غیر ممالک کے باشندے اس کا تصور کر لینے تک کہ روادار نہیں ہوتے ہوں گے

لیکن ہمارے بدبخت ملک میں فلم سازوں کی جہالت اور نادانی کی بدولت یہ لعنت دُور ہوتے نظر نہیں آتی۔ اسکے علاوہ سینما کے اشتہارات بھی اپنی مثال آپ ہوتے ہیں ان میں بیشتر انگریزی حروف میں فلم اور اداکاروں کے نام لکھے ہوتے ہیں پھر عنقریب ہیں اور آخر میں کسی گوشہ تنہائی میں باریک اور بے ڈھنگے حروف میں اُردو میں صرف فلم کا نام آتا ہے جو بعض اوقات پڑھا تک نہیں جا سکتا۔

میری رائے میں صرف یہی چیز اتنی اہم ہے کہ اس کی بنا پر اردو دان طبقہ فلموں کا بائیکاٹ کرے

فلمسازوں کے دماغ کو راہ راست پر لا سکتا ہے مین نے اکثر لوگوں سے اس بارے میں تبادلۂ خیالات کیا اور ہر شخص کو اس سے نالاں پایا۔

لیکن بائیکاٹ کی اس تحریک کو پیش کرنے اور آگے بڑھانے والا کوئی نہیں اس لیے ہر مرتبہ یہ تجویز کھٹائی میں پڑی رہی اسں تحریک کو آگے بڑھانے میں مجھے "فلم" سے بہتر کوئی اور رسالہ نظر نہیں آتا۔ براہ کرم اس قسم کے مضامین شایع کر کے پبلک اور آرٹ کی صحیح خدمت کیجئے۔ فقط

افکار و آرا

پربھات کا پڑوسی

تمام ہندوستان بڑی بیچینی سے اُفق پر پربھات کی جانب آنکھیں لگائے بیٹھا تھا کیونکہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ عنقریب ایک انتہائی روشن ستارہ نمودار ہوگا۔ آخر ایک شام آسمان پر روشنی کے چشمے پھوٹ نکلے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں یہ محفل انجم کا سب سے روشن ستارہ تھا۔ کچھ اصحاب کہتے ہیں نہیں چودھویں کا چاند۔ ایک نقاد نے تو یہاں تک کہا کہ یہ فلمی دنیا کا آفتاب عالمتاب ہے۔ جو شام کے وقت طلوع ہوا ہے۔ دراصل یہ تھا ہماری فلمی دنیا کے ناخدا شانتا رام کا پیام ہندوستان والوں کے نام۔ "پڑوسی" کی شکل میں۔

پڑوسی دو دوستوں کی کہانی ہے۔ جن کے جسم دو ہیں مگر روح ایک ہے دل ایک ہے ایک ساتھ ہنستے ہیں ایک ساتھ روتے ہیں ایک تکلیف میں ہوتا ہے تو دوسرا درد سے تڑپنے لگتا ہے ایک ہنستا ہے تو دوسرے کی رگوں میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ ہیں پڑوسی کے "ٹھاکر" اور "مرزا" "ہندو اور مسلمان" جو بساطِ ریاست کے دو بے بس مہرے ہیں جنھیں کوئی شاطر کھلاڑی آپس میں لڑا رہا ہے یہ کھیل اُس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک وہ لڑانے والا موجود ہے۔

پڑوسی میں مظہر خاں اور جاگیردار کے علاوہ آپ مشہور مغنیہ انیس خاتون کو بھی دیکھیں گے۔ اس فلم میں یہ تینوں اداکار اور ڈائرکٹر شانتا رام سب کے سب معراج پر نظر آرہے ہیں۔

پڑوسی بمبئی میں بارھویں ہفتے میں دکھایا جا رہا ہے۔ اس فلم پر ہم کسی آئندہ اشاعت میں تفصیلی تبصرہ لکھیں گے۔

نیو تھیٹرز نے اپنا سابقہ وقار پھر حاصل کر لیا۔

دو سال سے نیو تھیٹرز کی ترقیاں رو بہ زوال تھیں۔ کپال کنڈلا، زندگی، آندھی، نرتکی، اور ہار جیت جیسے فلم اس کمپنی کی تباہی کے اُن مراحلوں پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ جو اس نے پورن بھگت، دیوداس، ودیاپتی، پریزیڈنٹ اور دشمن سے لیکر نرتکی تک طے کئے۔ فلم بین طبقہ حیران مگر خاموش تھا نقاداں فن گلا پھاڑ پھاڑ کر منتظمین نیو تھیٹرز کو آگے پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہے تھے۔ مگر یہ کاروان تھا کہ خاموش چلا جا رہا تھا۔ فلمی صنعت کے بہی خواہوں کی ایک خاموش پریشانی کا انھوں نے خیال نہ کیا۔ ارباب صحافت کی آواز کو انھوں نے جنگلی درندوں کا بے معنی شور سمجھا۔ آج نیو تھیٹرز جس کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ یہ اسی غیر ذمہ دارانہ

(بقیہ مضمون بر صفحہ ۵)

سرکو کے آخری سانس ہمارے نامہ نگار خصوصی مقیم بمبئی کا تازہ ترین تار مظہر ہے کہ فلمی دارالخلافہ بمبئی کی مشہور کمپنی "سرکو" زندگی کی آخری سانس لے رہی ہے۔ اس عظیم ترین فلمی ادارہ کا وہی المناک حشر ہو رہا ہے جو ہر اُس تیز رو رہرو کا ہوتا ہے جو آنکھوں پر پٹی باندھے راستے کے نشیب و فراز سے لاپرواہ، اپنے پاؤں کے ضعف سے بے خبر ہو کر دوڑتا ہے۔

بمبئی کے فلمی حلقوں میں یہ خبریں گشت کر رہی ہیں کہ مسٹر ترویدی ایک ہفتہ کے اندر "سرکو" کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیں گے۔

اِن حالات سے متاثر ہو کر ڈائرکٹر عبدالرشید کاردار نے رنجیت کے مالک چندولال سے گفت و شنید شروع کر دی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ "سوامی" ختم کرتے ہی رنجیت میں شامل ہو جائیں گے:

دیوکی بوس اور "اپنا گھر" سرکو میں جو زلزلہ آیا ہے اس سے دیوکی داس کے "اپنا گھر" کی دیواریں بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں۔ توقع کیجاتی ہے کہ وہ عنقریب "اپنا گھر" بمبئی سے اٹھا کر کلکتہ [illegible] دیں گے۔ جہاں وہ نیو تھیٹرز کے مالک مسٹر بی این سرکار سے اس زیر تعمیر عمارت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مشورہ کریں گے۔

نسیم رنجیت میں جن دنوں یہ ستارہ منروا کے آسمان پر چمکتا تھا، تب بھی چندولال شاہ کی خواہش تھی کہ وہ اُسے کسی طرح حاصل کر کے رنجیت کی تصویروں میں ٹانک دیں۔ اب یہ افواہ اڑ رہی ہے کہ نسیم سرکو سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد رنجیت میں شامل ہو جائیگی۔ ایک اور خبر یہ بھی ہے کہ یہ مشہور اشتہار باز "مغنی" کی شرکت میں ایک نئی کمپنی کی داغ بیل ڈالنے پر سوچ بچار کر رہی ہے۔

نیشنل اسٹیڈیوز کی مصروفیات چھوٹی بہو اور سادھنا کے ڈائرکٹر دریندر دیسائی کی تازہ ترین فلم "راجھی کا" آجکل بمبئی کے پاتھے سینما میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ اس میں نلینی جیونت، ہریش، سنکھٹا پرشاد، کنیالال، جیوتی، اور بوڑاڈوالی نے کام کیا ہے محبوب، بہن کے آخری مناظر فلما رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ محبوب کی "بہن" "محبوب کی عورت" سے کہیں زیادہ دلچسپ اور شاندار ہوگی۔ اس میں نلینی جیونت اور شیخ مختار اداکاری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اس ہونہار ڈائرکٹر کی آئندہ فلم "روٹی" ہوگی۔ ڈائرکٹر ٹھاکر "کسوٹی" فلما رہے ہیں۔ روز ہیروئن کا کردار پیش کر رہی ہے اور ڈائرکٹر چمن کانت نے "آسرا" کو آخری منزل پر پہنچا دیا ہے اس فلم میں ستارہ اختر کام کر رہی ہے

سلطنت آصفیہ کی واحد صنعت
ٹریڈ مارک
TRADE MARK
DECCAN BUTTON FACTOR
دکن بٹن فیکٹری
THE DECCAN BUTTON FACTORY
HYDERABAD DECCAN.

مولوی غلام محمد مصطفیٰ صاحب

آپ کا تبادلہ مددگاری ناب حکومت سے "ڈیویژن افسری" کی خدمت پر بمقام جالنہ عمل میں آیا۔ بتاریخ ۷۔ خورداد آپ کو حلقہ (الف) کے سینکڑوں باشندگان نے کاچی گوڑہ اسٹیشن جاکر "خدا حافظ" کہا، اسی پرچے میں آپ کے متعلق ایک نوٹ درج کیا جارہا ہے۔

جناب سید احمد محی الدین صاحب رضوی

(انسپکٹر جنرل۔ محکمہ رجسٹریشن)

آپ کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ اسی پرچہ میں شایع کیا جارہا ہے۔

خالدہ سلطانہ

(دختر بیگم خویشگی۔ مدیرہ ہمجولی)

جنہیں حیدر آباد کی حالیہ مشہور نمائش اطفال میں درجہ اول کے متعدد انعامات ملے

مسٹر معین الدین کولاس

صدر محمن لدیہ حیدر آباد

سید سعد اللہ قادری میڈل کمیٹی
کا
پندرہ روزہ رسالہ

جلد ۱ شمارہ ۲ — حیدرآباد دکن — ۵ اپریل ۱۹۳۹ع

آنریبل نواب جسٹس اصغر یار جنگ بہادر
ممبر، سید سعد اللہ قادری میڈل کمیٹی

سالانہ چندہ ۴ روپیہ

قیمت فی پرچہ دو آنہ

Printed at the Osmania University Press
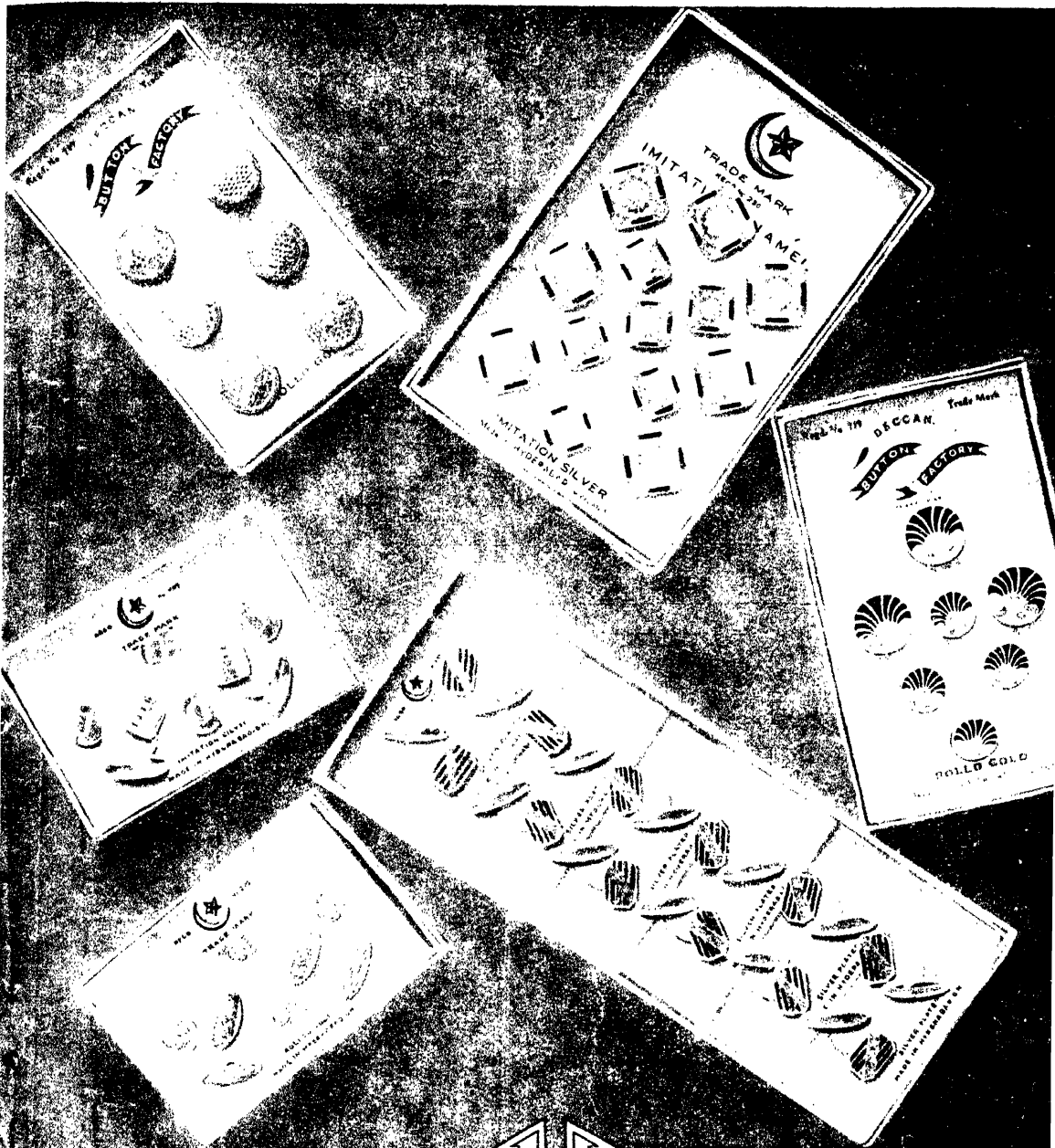
DECCAN
BUTTON FACTORY
Trade Mark
TRADE MARK
IMITATION SILVER
ROLLD GOLD
دکن بٹن فیکٹری
حسینی علم
حیدرآباد دکن
THE DECCAN BUTTON FACTORY
HUSAINI ALAM HYDERABAD DN. TEL. ADDRESS BUTTON. ESTD. (1916)

چندی سرسوتی سنیٹون کے "یہ سچ ہے" نامی فلم میں

کوہر

مادھوری

اندو رانی

اشوک کمار

کملیش کماری

کنن بالا نیو تھیٹرز کے "اسٹریٹ سنگر" میں

"اسٹریٹ سنگر" کا ایک سین

"اسٹریٹ سنگر" کا ایک سین

ہما

رتن پربھا

To-Night AT **To-Night**

PALACE TALKIES

Hyderabad-Deccan
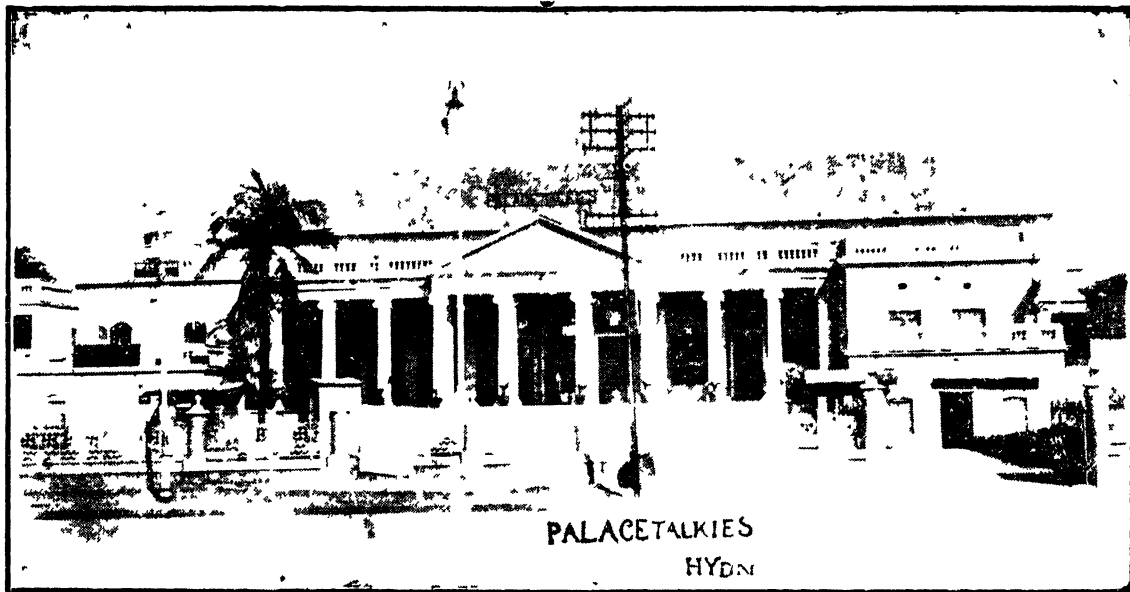
NEW THEATRES
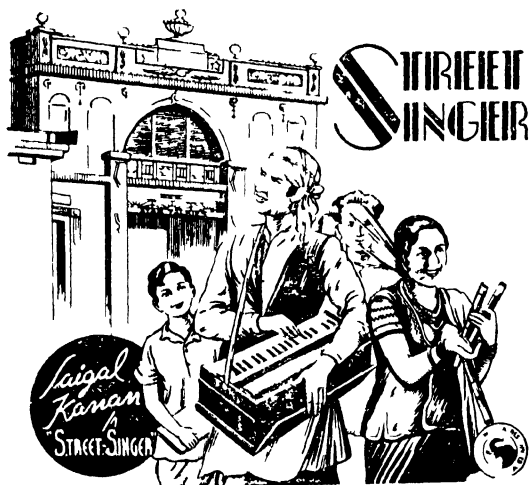
Great Musical Romance

STREET SINGER

It is a marvellous melodrama describing the lives of two street urchins (Saigal and Kanan). Their drifting on the Sea of Life—Their *Happiness* and *Sorrows*—Their *Love* and Thier mutual *Attachment;* All this is very *Subtly* and *Skillfully* woven into this great *Masterpiece*. As a Musical Extravaganza *Street-Singer* sets a new *Standard* for *Indian Pictures*.

ABLY PLAYED BY

Saigal and Kananbala

supported by;

Jagdish, Bikram Kapoor, Ramkumari and others

(COMING)

Prabhat's	*Bombay Talkies*	*Saraswathi's*
MY SON	**BHABI**	**IT IS TRUE**

ایڈیٹوریل

رسالہ فلم کی قبولیت ۲۰ مارچ کو رسالہ فلم کا پہلا پرچہ شایع ہوا۔ اس کی عام خریداری سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل ملک پسندیدہ نظر سے دیکھ رہے ہیں رسالہ پر جو کچھ مصارف عاید ہو رہے ہیں۔ وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ باوجود ان کثیر اخراجات کے قیمت کم رکھی گئی ہے تاکہ ہر شخص بآسانی خرید سکے۔ اس کی بقاو بہبود عام خریداری پر منحصر ہے۔ اگر اہل ملک نے خاطر خواہ اعانت کی تو یقین ہے کہ یہ نہ صرف دکن بلکہ باہر بھی کافی قبولیت حاصل کریگا۔ اس کی سرپرستی وطن کی عین نیک نامی ہے۔

ہندوستان سے باہر بھی اس کی مانگ ہے، لندن، جرمنی، امریکہ، برما، عدن، سیلون اور سنگاپور سے اس کی ایجنسیوں کے اکثر آرڈر وصول ہوئے ہیں۔ موخر الذکر تین مقامات کی خریداری ہمعصر مصور کے تشہیر کی رہین منت ہے۔ جس سے امید بندھتی ہے کہ مستقبل قریب میں یہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ جائیگا۔

لندن کے مشہور کتب فروش مسرک لوزک کو اس کی ایجنسی دی گئی ہے۔

ہندوستان کو کس قسم کے فلموں کی ضرورت ہے؟ ہمارا پہلا شمارا "فلموں کے لیے موزون ترین زبان" کے عنوان سے مختص تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر متعدد مضامین موصول ہو چکے ہیں اس لیے اس کے چند شمارے اسی مبحث سے مختص رہینگے۔ البتہ آئندہ جس عنوان پر مضامین درکار ہیں وہ یہ ہے:۔ "ہندوستان کو کس قسم کے فلموں کی ضرورت ہے" محترم مضمون نگاروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی اوّلین فرصت میں عنوانِ بالا پر مضامین تحریر فرمائیں۔

فلم جرنلسٹ اسوسی ایشن آف انڈیا ۱۶ مارچ ۱۹۳۹ء کو دفتر فلم انڈیا بمبئی میں چند جرنلسٹ جمع ہوئے اور انہوں نے "فلم جرنلسٹ اسوسی ایشن آف انڈیا" کے نام سے ایک ادارہ قایم کیا جس کے صدر بابوراؤ پٹیل اڈیٹر فلم انڈیا ہیں۔ یہ اسوسی ایشن دو نائب صدر، آٹھ اراکین، دو شریک معتمد اور ایک خزانچی پر مشتمل ہے۔ کرپارام اڈیٹر مووییز یوپی اور یل۔ سی بھلا مدراس کے صوبہ جاتی نمایندے مقرر ہوئے ہیں۔

رام بگائی ۔ ہائی ڈو سے روابط و اتحاد پیدا کرینگے ۔ پی جی بھگوت آنریری آڈیٹر بنائے گئے ہیں ۔ بہرطور بمبئی کے جرنلسٹ حضرات کی یہ سعی قابل آفرین ہے ۔ اور اس کے مفید مقاصد سے ہمیں پورا اتفاق ہے ۔ مگر اس موقع پر یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ہندوستانی صنعت فلم اُردو صحافت کے زیر بار احسان ہے ۔ کیونکہ یہ جب ابتدائی حالت میں تھی تو اردو صحافیوں نے اسے سہارا دیا اور ابھی تک اس کی خدمت کر رہے ہیں افسوس کہ اس میں اُردو فلمی صحافت کے کسی مشہور جرنلسٹوں کو شریک نہیں کیا گیا ۔ حالانکہ ضروری تھا کہ ایسے اداروں میں فلمی انشاء پردازوں اور اڈیٹروں کو دعوت دی جاتی ۔ اور ان کے گراں مایہ مشوروں سے استفادہ کیا جاتا ۔ تاکہ یہ صنعت اِن کی رہنمائی میں ترقی کے منازل آسانی کے ساتھ طے کر سکے ۔ چونکہ یہ ادارہ جرنلسٹوں پر مشتمل ہے ۔ اس لیے ہم اس کے صدر بابوراؤ پٹیل سے خواہش کرتے ہیں کہ وہ اردو کے فلمی جرنلسٹوں اور اڈیٹروں سے شرکت کی استدعا کریں ۔ چند نام اطلاعاً [illegible]ج ذیل کیے جاتے ہیں :۔

(۱) اویس احمد ادیب (۲) مسعود صابری (۳) ظفر تبریزی ([illegible]

(۶) خواجہ قدوائی (۷) لطیف احمد علوی (۸) محشر عابدی (۹) وا[illegible]ے طارق وغیرہ ۔

حیدرآباد میں حادثۂ بم اور سنیما چند اشرار نے ملک کی پرامن فضا کو مکدر کرنے کے لیے مختلف مقامات پر چار بم رکھ دیے تھے ۔ جس سے اکثر مجروح ہوئے اور ایک دو ہلاکتیں واقع ہوئیں ۔ یہ مذموم حرکت ہر حیثیت سے قابل نفرین ہے ۔ اس سلسلہ میں مقامی پولیس کے انتظامات مستحق ستائش ہیں ۔ اور خاص کر ایک عہدہ دار پولیس مولوی احمد شاہ خاں کی جانبازی و بہادری کا واقعہ جو کہ انہوں نے شاہراہ عام کے ایک بم کو اٹھا کر پانی کی ٹیپ میں رکھ دیا ۔ قابل تعریف ہے ۔

اس بم بازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنیماؤں میں لوگ کم آرہے ہیں اور رات کے دوسرے شو میں سنیما ہال بالعموم خالی رہتے ہیں اس لیے کہ رات کی واپسی آج کل خطرناک سمجھی جاتی ہے ۔

ایک دل آزار فلم آر ۔ کے ۔ او ۔ ریڈیو پکچرس کی مشہور و معروف فلم "گنگا دین" کی نمائش حکومت بنگال نے ممنوع قرار دی ہے ۔ اس وجہ سے کہ اس فلم میں ہندوستانیوں کی تہذیب و معاشرت کو نہایت مبتذل طریقہ پر پیش کر کے ان کی سخت توہین و دل آزاری کی گئی ہے ۔ ہم دیگر صوبجات سے بھی اسی طرزِ عمل کے متوقع ہیں ۔ اور "بنگال سنسر بورڈ" کے اس اقدام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ۔

ہند میں فلم کی زبان

پروفیسر آقا سید محمد علی داعی الاسلام "مؤلف فرہنگ نظام"
(جن کو شہنشاہِ ایران نے ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں نشان علمی درجہ اول عطا فرمایا)

اس ملک میں متعدد زبانیں ہیں اور اُن میں بعض ادبی ہوگئی ہیں ۔ جیسے اُردو، ہندی، مرہٹی، بنگالی، پنجابی وغیرہ اور اُن میں اُردو کو اہمیت حاصل ہے کہ خاص یونیورسٹی رکھنے کی وجہ سے جدید علمی زبان ہوگئی ہے، اُس کے بات کرنے والوں کی تعداد دوسری ہندوستانی زبانوں سے بہت زیادہ ہے ۔ نو کروڑ مسلمان اُردو سے واقف ہیں اور ہند کے باقی بتیس کروڑ باشندوں میں اکثر اُس میں بات کرتے یا سمجھتے ہیں، ہند کی باقی زبانوں میں سے ہر ایک زبان خاص صوبہ یا صوبوں کی ہے ۔ دکن کی زبانیں شمال میں نہیں ہیں و بالعکس لیکن اُردو ایک ایسی زبان ہے، جو کہ شمال میں بھی مادری ہے اور دکن میں بھی ۔ دکن کے ہر ایک صوبہ میں سمجھی جاتی ہے ۔ اور شمال کے ہر صوبہ میں بھی ۔ اُردو کو مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر اس وقت بنایا جب کہ وہ ہند بھر میں حکومت کرتے تھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہند کی عام زبان ہوگئی تھی ۔ ہند ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں کے لوگ بستے ہیں، اس میں ایک عام زبان کی ضرورت تھی جس کو مسلمانوں اور ہندوؤں نے بنایا ہر چند اس کے بنانے میں مسلمانوں کا بہت بڑا قومی نقصان تھا ۔ ہند کی اس ضرورت کو مسلمانوں نے اپنے سلطنتی اقتدار کے زمانہ میں پورا کر دیا اور اس وجہ سے کہ اس زمانہ میں ہندو مسلمان شیر و شکر تھے تو کسی قسم کا اعتراض کہیں سے بھی سننے میں نہیں آتا تھا لیکن جب ہند میں باہر والوں کی سلطنت ہوگئی تو سیاست نے اپنی جدّت دکھائی اور ہندوؤں میں احساس پیدا ہوگیا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اس سے چشم پوشی کر کے ایک ہندو زبان کو ہند کی عام زبان بنانا چاہیے اور اس وجہ سے کہ ہندی بھاشا اُردو سے قریب ہے ۔ یہ تصور کیا گیا کہ اُس کو اُردو کی جگہ لینا چاہیے اور حتی الامکان کوشش بھی ہو رہی ہے ۔ اب اس موضوع پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں لیکن اول اپنا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ہندی نہیں ہوں کہ میرے ذہن میں اُردو یا ہندی کی محبت یا لگاؤ ہو، میں ہندی اور اُردو دونوں کو سیکھا ہوں اور دونوں کی اصل سنسکریت کو بھی سیکھا ہوں ۔ مجھے امید ہے کہ میری رائے غیر جانبدارانہ سمجھی جائیگی ۔ خصوص جب کہ مجھ کو اُردو سے ایک نوع کی دشمنی ہے کیونکہ میں اُس کو ہندی مسلمانوں کی تباہی کا واحد سبب سمجھتا ہوں اگر وہ اپنی اصلی زبان (فارسی) کو نہ چھوڑتے تو وہ بھی آج ترکی اور ایران کی طرح اُٹھنے کی قوت رکھتے تھے اور اُن موہومات و خرافات میں

بتلانا رہتے جو اُردو کی وجہ سے اُن پر مسلط ہیں۔

فیلم کی زبان دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک وہ فیلم جو کہ خاص صوبہ کے لیے تیار ہوتی ہیں اُن کی زبان اُسی صوبہ کی زبان ہونا چاہیے۔ جب مرہٹی صوبہ کے لیے خاص فیلم تیار کیے جاتے ہیں تو اُن کی زبان مرہٹی ہونا ضروری ہے۔ ویسا ہی گجرات، تلنگانہ، پنجاب، وغیرہ، لیکن ایسے فیلم تجارتی نقطہ نظر سے کم فایدہ بخش ہوتی ہیں لہذا کم تیار ہوتی ہیں۔ دوسری وہ فیلمیں جو کہ ایک وسیع زبان میں تیار ہوتی ہیں جن سے تجارتی نفع زیادہ ہوتا ہے۔ ایسی فلموں کے لیے اُردو ہی موزوں ہے، جو کہ ہند بھر کی عام زبان ہے۔ اور یہ رائے کہ عام زبان چھوڑ کر ایک محدود زبان جیسے ہندی، بنگالی، پنجابی، سندھی، وغیرہ، کو فیلمی زبان اختیار کیا جانے ایک غیر عملی رائے ہے، میری نظر میں شمالی ہند کے ہندوؤں کا یہ خیال کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور بھاشا کو ترقی دے کر اس کو اُردو کی جگہ دینا چاہیے، درست نہیں ہے اُردو ایک ہندوی زبان تھی جس کو مسلمانوں نے فقط ہندو برادری حاصل کرنے کے واسطے لیا اُن میں فارسی الفاظ داخل کر کے اس کو ایک علمی زبان کی حیثیت دی، جس کو سارے ہند بھر کے ہندوؤں نے بھی پسند کیا تھا ہندوؤں کو اُردو پر دو اعتراض ہو سکتے ہیں اول یہ کہ اس میں فارسی اور عربی الفاظ داخل ہو گئے جو کہ ہند سے اجنبی ہیں دوم یہ کہ اُردو کا خط فارسی سے لیا گیا ہے وہ ملکی نہیں ہے۔ برخلاف ہندی کا خط جو کہ دیوناگری اور ملکی ہے۔ اول کا جواب یہ ہے کہ معترض علم تناسب السنہ Comparative Philology سے واقف نہیں ہیں ورنہ ان پر واضح ہو جاتا کہ فارسی بھی ہندی کی طرح سنسکرت کا ایک بچہ ہے اور فارسی الفاظ کے ریشے سب سنسکرت میں موجود ہیں میری تالیف فرہنگ نظام کو ملاحظہ کیجیے۔ اس میں فارسی الفاظ کے اصل سنسکریت بھی دیے گئے ہیں، فارسی اور ہندی دو چچازاد بھائی ہیں سنسکریت دونوں کی دادا ہے لیکن ایک کو دوسرے سے اجنبی سمجھنا نادانی ہے۔ رہے عربی الفاظ جو کہ فارسی کے ذریعہ اُردو میں شامل ہو گئے۔ اُن سب کے ریشے سنسکرت میں موجود ہیں وہ بھی ہندی سے اجنبی نہیں ہیں۔ فرہنگ نظام جلد دوم کے دیباچہ کے صفحے مبسوط ملاحظہ ہوں۔ نیز میری تالیف کتابچہ نمبر (۱) کا لکچر پنجم ملاحظہ ہو۔ آپ سمجھتے ہیں کہ "غرور" عربی لفظ ہے اور ہندوستان میں غیر ملکی ہے اور اس سے ناواقف ہیں کہ یہ وہی سنسکریت "گرو" गर्व ہے آپ "ندی" नदी کو سنسکریت لفظ سمجھتے ہیں حالانکہ وہ عربی لفظ "نداء" بمعنی آواز سے ہے، آپ "آفت" کو عربی جانتے ہیں، دراصل وہ سنسکریت میں آپت आपत ہے۔ عربی کے "کل" کا ریشہ سنسکریت میں "اکیل" आकल ہے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا اعتراض اُردو کے خط پر ہے کہ وہ بھی غیر ملکی ہے لیکن جب مسلمان اُردو کو بناتے تھے تو اس موضوع پر بھی انہوں نے کافی غور کے بعد فارسی خط کو اس وجہ سے ترجیح دی کہ وہ لکھنے میں بہت آسان ہے شارٹ ہینڈ بھی

ہے جس کے لکھنے میں وقت بہت کم صرف ہوتا ہے، اگر آپ ہمت کا لفظ اُردو میں لکھنا چاہیں تو ایک ہی جنبش قلم سے ایک سکنڈ میں لکھ سکتے ہیں اور ہندی خط میں हिम्मत پانچ جنبش قلم اور چار سکنڈ میں لکھا جاتا ہے۔ فارسی خط کے بارے میں میری تالیف "خطِ داعی" دیکھی جائے۔ اس وقت ہماری نظر میں دیوناگری اور فارسی خط الگ الگ اصل سے معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ہم خط کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس وقت دنیا میں (بہ استثناء خطِ چینی) جتنے خطوط ہیں سب کا اصل عبرانی خط ہے، یورپ کا خطِ لاتین جو کہ جدید یورپین خطوط کا اصل ہے، خطِ عبرانی سے لیا گیا ہے اور a, b, c, d وہی عبرانی ابجد ہیں اور e, f, g وہی ہوّز ہیں۔ دیوناگری خط بھی عبرانی سے لیا گیا ہے اس بارے میں فرہنگِ نظام کی جلد دوم وسوم کے دیباچے ملاحظہ ہوں۔

اُردو اور ہندی دونوں خطوط کے اصل ایک ہی ہیں۔ جب دو بھائی کا باپ ایک ہے تو ایک دوسرے کو اجنبی نہیں سمجھنا چاہیے۔

فلم اور اردو

مولوی سید وزیر حسن صاحب

سچ یہ ہے اُردو ایک نیچ میل مٹھائی ہے۔ اس میں جتنی زبانیں ملی جُلی ہیں، اُن میں کوئی بڑھے یا گھٹے تو اس کا مزہ بدل جائیگا۔ یہ ایک کھُلی بات ہے۔ جس کو ہر ایک آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی اسے نہ سمجھے، یا سمجھنا چاہے۔

جیسا بارہا کہا گیا۔ خود اُردو کا لفظ اس کا پتہ دیتا ہے کہ یہ ساجھے کی زبان ہے۔ اُردو کے معنے لشکر کے ہیں۔ اگلے وقتوں لشکر میں جب ایسے لوگ اکھٹے ہوئے۔ جن کی بھانت بھانت کی بولی تھی۔ تو انہیں بات چیت کرنے میں مشکل ہونے لگی۔ بلا بات کئے کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس لیے ہوتے ہوتے اُردو کی بنا پڑی۔

یہ دیکھتے ہوئے اُردو جس طرح کل کام کی تھی۔ آج بھی کام کی چیز ہے۔ مگر کچھ دن سے یہ ہو رہا ہے کہ فلم کے ہاتھوں یہ انجانی سے یا جان بوجھ کر تیزی سے چولا بدل رہی ہے۔ اس لیے کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کے بسنے والے جب آج بھی بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے الگ ہیں تو یہ ساجھے کی بولی نری بولی نہیں۔ ایک مبارک بندھن ہے جس سے بچھڑے ملے ہیں۔ بکھرے اکیجا ہوئے ہیں۔

فلم میں اُردو کو سچے رنگ سے ہٹانا سب سے بُرا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو سب کے سامنے آتی ہے۔ اس طرح بہت سوں کے قدم ڈگ جائینگے۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ یکرنگی ہندوستان کو ایک رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔ اس وقت ان کے سوچنے والے دماغ اور دیکھنے والی آنکھیں کہاں چرنے چلی گئی ہیں۔ وہ کیوں ایسا ہونے دے رہے ہیں۔ وہ کیوں نہیں سوچتے سمجھتے کہ ہمارے پاس کم سے کم ایک زبان تو ایسی ہے۔ جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جس سے ہم ایک ہیں۔ اور ایک رہ سکتے ہیں۔ پھر ایک ایسی اچھی بھلی زبان کی یہ بربادی کیوں؟ بڑے اچنبے کی بات ہے کہ وہ مُنہ اُٹھائے تاروں کو دیکھ کر تو رستہ چل رہے ہیں۔ مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے پیروں تلے جگنو کچلا جا رہا ہے۔

خیر تو اُردو کو ساجھے کی زبان نہ سمجھنا ایک بھول ہے۔ مگر اس کو اس کے سچے رنگ سے ہٹانا اور بھی بڑی بھول ہے۔ اُردو میں تو جتنی زبانیں ہیں ان کا برابری سے رہنا ہی اچھا ہے۔ اب اگر فلم کے ہاتھوں کسی ایک زبان کی چاشنی بڑھیگی تو تو دوسری زبانوں کے رسیا بھی اپنی اپنی زبانوں سے اُردو کو سینچینگے۔ اس سے بیٹھے بٹھائے بات بڑھیگی۔ اُلجھاوا پیدا ہوگا۔ اور یہ زبان اتنی کام کی نہیں رہیگی جتنی اب ہے۔ یا آگے چل کر ہو سکتی ہے۔ اس طرح ہوگا یہ کہ ہماری زبان بھی بگڑیگی اور دل بھی بگڑ جائینگے!

فلم کی زبان

مولوی مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب

یہ بات مان لی گئی ہے کہ ہندوستانی فلم کے افسانوں کی بنیاد زیادہ تر عشق و محبت پر ہوتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس کے اظہار کے لیے کونسی زبان اختیار کی جائے جو اپنے حقیقی معنوں میں اس طرح اظہار خیال کر سکے جسے سُن کر پڑھے، ان پڑھ، مرد، عورت، جوان، بڈھے، مرہٹے، تلنگے، تاملے، کنڑے، اُڑیائی، بنگالی، سندھی، پنجابی، افغانی، ایرانی، ملیباری۔ شمالی اور دکھنی غرض یہ کہ ہندوستان کے دو سو سے زیادہ زبانیں بولنے والے بلا کسی دقت کے اُسے سمجھ سکیں اور عشق و محبت کا مزا لے سکیں۔

کہتے ہیں کہ جس چیز سے لوگ زیادہ محبت کرتے ہیں اُس کا ایک سے زیادہ نام رکھ لیتے ہیں۔ اگر زباں کی حد تک یہ بات صادق آتی ہے تو وہ صرف ایک زبان ہے جو ہندوستان میں نانگا پربت سے لے کر راس کماری اور راس کماری سے کلمبو، رنگون، ہانگ کانگ، شنگھائی پھر دوسری طرف عدن، بصرا، بغداد، سوئز اور جنوبی افریقہ تک چلے جائے تو آپ کو ایک ایسی ہندوستانی زبان ملیگی جسے آپ بولینگے تو اُس ملک کے لوگ سمجھ لینگے اور وہ لوگ بولینگے تو آپ سمجھ لینگے۔

غالباً اس زبان کی ابتداہی سے ایسی مقبولیت رہی ہے کہ ہر دور میں اس کار آمد زبان کا ایک نیا نام رکھ لیا گیا تھا جو ہر طبقہ اور ملت میں اس کی ہر دلعزیزی کا بیّن ثبوت ہے۔ چنانچہ ایک زمانہ میں کوئی اِسے ہندوی کہتا تھا تو کوئی ہندی اور کوئی لشکری کہہ کر پکارتا تھا تو کوئی اُردو، کوئی کھڑی بولی بولتا تھا تو کسی نے اس کا نام ریختہ رکھ دیا تھا اور اِس زمانہ میں کسی نے اس کا نام ہندی ہندوستانی رکھنا چاہا تو کسی نے اصرار کیا کہ اُردو ہندوستانی پکاری جائے۔ بہرحال یہ وہی زبان ہے جس کو ہندوستان میں عام طور پر بولا اور سمجھا جاتا ہے اور یہ وہی زبان ہے جو آج کل "ہندوستانی" کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے اگر کوئی ہوشیار اور سمجھ دار ہندوستانی جاننے والا ایکسٹر دنیا کے اکثر و بیشتر حصوں میں چلا جائے تو وہ ان ملکوں میں جاکر دوسرے اجنبی مسافروں کی طرح زیادہ پریشان نہیں ہوگا بلکہ کچھ نہ کچھ آئیں بائیں، شائیں کرکے اپنا مطلب ضرور ادا کر جائیگا اور سُننے والے بھی اس کی بات سمجھ لینگے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کے چھان بین کرنے والوں نے یہ پتا لگایا ہے کہ نیچے طبقہ کے لوگ صرف دو ڈھائی سو الفاظ میں اپنا مطلب

ادا کر دیتے ہیں اور اس سے زیادہ الفاظ کی انھیں ضرورت نہیں ہوتی۔ گر بیسک انگلش Basic English کے ماہرین نے نہایت غور و فکر کے بعد انگریزی زبان میں سے (۸۵۰) الفاظ ایسے چن لیے ہیں جو تمام قسم کی گفتگو پر حاوی ہیں اور وہ Basic یا بنیادی الفاظ کہلائے جاتے ہیں

اس نقطۂ نظر سے جانچو تو ہندوستانی کے خزانہ میں تقریباً ساٹھ ہزار الفاظ ہیں، جن میں سنسکرت، ہندی، پنجابی اور دوسری زبانوں سے مل کر بنے ہوئے الفاظ کی تعداد چالیس ہزار کے قریب ہے عربی زبان کے ساڑھے سات ہزار سے زائد ہیں، فارسی کے چھ ہزار کے قریب ہیں اور انگریزی، ترکی، عبرانی، سریانی، یونانی، لاطینی اور پرتگالی وغیرہ کے چھ ہزار سے زائد ہیں۔ یہی راز ہے کہ یہ زبان زندہ، پائندہ عام پسند اور عالمگیر بن گئی ہے۔ اس کا دربار مجلس اقوام League of Nation کا نمونہ نظر آتا ہے جس میں مختلف زبانوں کے نمایندے موجود ہیں اور ایک ہی جملہ میں مختلف زبانوں کے الفاظ پہلو بہ پہلو موتی کی طرح جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جو توسن ہرسے آئی اس پر لٹو ہو گئی ایرانی جو اپنی زبان کو دنیا کی تمام زبانوں سے زیادہ شیریں اور عام فہم سمجھتے تھے وہ بھی اس کے پھندے میں ایسے پھنسے کہ بجائے فارسی کے اُردو شاعر بن بیٹھے۔

واقعہ یہ ہے کہ جہاں دو چار برج بھاشا اور دو چار فارسی کے الفاظ ملائے اور مطلب ادا ہو گیا۔ سُنا ہے کہ کسی ہندوستانی نے ایرانی سے گفتگو کی، وہ فارسی سے ناواقف اور یہ اُردو سے لاعلم مگر دونوں میں گھنٹوں گفتگو ہوتی رہی۔ پھر لطف یہ کہ وہ اُن کی بات سمجھ لیتا تھا اور یہ اُن کی بات سمجھ لیتے تھے۔ اس نمونہ کا ایک جملہ ہم بھی لکھ دیتے ہیں تاکہ لکھا ہوا باقی رہے اور وقتِ ضرورت کام آجائے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"بہ زیر درختِ بیری نشستہ بودم کہ یک پتھر زن زناتا و بھن بھناتا برسرم رسید اگر سر نہ جھکائیندہ بودم برکھوپڑی کھٹاک شود"

ادھر فارسی شعرا نے دیکھا کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ فارسی میں شعر کہتے کہتے طبیعت گھبرائی تو اُردو میں شاعری شروع کر دی۔ اگرچہ یہ شعر ابتدائی زمانہ کے ہیں مگر اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کو اِس سے کس قدر محبت تھی اور کس طرح اُنھوں نے فارسی میں ہندی کے جوڑ لگا کر ریختہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ سعدی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

قشقہ چو دیدم بر رُخت گفتم کہ یہ کیا دیت ہے	گُفتا کہ دُر ہو باورے اس شہر کی یہ ریت ہے
ہمنا تمھن کو دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا	ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی کہ گفتا ریختہ، دُر ریختہ، دُر ریختہ	شیر و شکر آمیختہ، ہم ریختہ، ہم گیت ہے

یہ زمانہ تو ابتدائی تھا، ریختے کی بنیاد پڑ رہی تھی، خیالات کے اظہار کرنے کے لیے کافی الفاظ موجود نہیں تھے، اِس لیے صرف مطلب برآری کے لیے یہ جوڑ توڑ کیے گئے تھے مگر قابلِ رحم حالت تو اب ہے کہ

اظہار خیال کے لیے کافی سے زیادہ ذخیرہ موجود ہے، عام فہم اور سلیس الفاظ بھی سامنے ہیں مگر بار لوگ زبردستی موٹے موٹے عربی اور سنسکرت کے الفاظ ٹھونستے چلے جا رہے ہیں جن کو سُن کر بڑے بڑے مُلّا اور پنڈت بھی گھنٹوں چکر میں رہتے ہیں اور بغیر شبد ساگر، غیاث اللغات اور قاموس دیکھے ہوئے اُن کا کام نہیں چلتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہم نے حیدرآباد میں وِدّیا پتی کے آمد کی خبر سُنی۔ اول تو ہم سمجھے کہ یہ شاید وِدّیا ساگر کے رشتہ دار ہیں جو حیدرآباد دیکھنے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ لیکن تحقیقات کرنے کے بعد پتہ چلا کہ آپ کوئی آدمی نہیں ہیں بلکہ تماشا ہیں۔ ہم نے سوچا کہ ہم نے اندر سبھا دیکھا، مہابھارت دیکھا، رامائن دیکھا، سیتا بن باس اور مادھوری دیکھا مگر یہ نام تو کچھ ایسا عجیب و غریب ہے کہ آج تک کانوں سے ایسا نام سنا اور نہ آج تک آنکھوں سے ایسا تماشا دیکھا۔ بس دل میں پکا ارادہ کرلیا کہ اس کو دیکھینگے اور ضرور دیکھینگے۔ القصہ ہم سیکنڈ شو میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری کرسی پاس یعنی دوسری کرسی پر ایک مہاراج نہایت اطمینان کے ساتھ ٹانگیں پھیلائے لیٹے ہوئے ہیں۔ ڈاڑھی مونچھیں صاف، معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بھدرا کراکر آ رہے ہیں، سر پر سوا بالشت کا چوٹی، ماتھے پر آدھے بالشت کا تلک، سر سے پاؤں تک کھدر میں لپٹے ہوئے آنکھیں بند کیے خرّاٹوں پر خرّاٹے لے رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہی تاڑ گئے کہ ابھی تماشے میں دیر ہے اس لیے مہاراج بھگتی کی تلاش میں مُکتی کی سیر کر رہے ہیں۔ یوں تو ہم بھی بھگوان کی کرپا سے تھوڑی بہت ہندی بھاشا سمجھ لیتے ہیں مگر مہاراج کی شکل دیکھ کر ہمارے ہردے کو اور بھی شانتی ہوگئی کہ خدا نے چاہا تو آج ہندی کا ایک شبد بھی ہم سے نہیں چھوٹیگا۔ بہت کچھ تو خود بھی سمجھ لینگے اور جو سمجھ میں نہ آئیگا وہ مہاراج سے پوچھ لینگے، اس لیے ہم نے ان کو جگا کر دوستی کی راہ نکالی اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں تو معلوم ہوا کہ وہ صرف مہاراج ہی نہیں ہیں بلکہ کسی پاٹ شالا کے پدّاپنتھلو یعنی مہا ہوپادھیا بھی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تماشا شروع ہوا اور ہم دیکھنے میں مصروف ہوگئے۔ بیسیوں ہندی الفاظ تھے جو راج کوی اور مہا منتری جی کے منہ سے نکل رہے تھے اور بالکل ہمارے سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

اس لیے ہم نے ان الفاظ کے معنی دریافت کرنے کے لیے ذرا اُن کو جھنجوڑا اور آہستہ سے معنی پوچھے لفظ سنتے ہی مہاراج نے اپنے ابرؤں پر بل ڈالے، پھر اس طرح منہ پھاڑا کہ گویا ہم کو کچّا ہی نگل جائینگے، اس کے بعد بچکلی کے اپنی مٹھی بند کی اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاکے ہمیں گھورنا شروع کردیا۔ ہم سمجھے کہ شاید ہم نے مہاراج کو سنسکرت میں گالی دیدی ہے جو یہ اپنے آپے سے باہر ہوگئے۔ اس لیے ذرا دور دور کھسک گئے کہ کہیں یہ جوش میں ایک گھونسہ نہ رسید کردیں۔ مگر ہمیں بہت جلد معلوم ہوگیا کہ خود ہمارے پدّاپنتھلو صاحب کو اُن الفاظ کے معنی معلوم نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا کہ ماشاجی! یہ بھاشا تو ورج وھاشا ہے۔ ہم تو کیا ہمارے پتاجی کے سمجھ میں بھی نہیں آسکتی۔

چنانچہ مٹھی بند کر کے ہاتھ آسمان پر اُٹھا دینے کے یہ معنی تھے کہ ہاں اگلے جنم میں یہ شبد ضرور سُنے تھے، آنکھیں اور منہ پھاڑنے سے یہ مراد تھی کہ اس لفظ کی تصویر آنکھ میں اور معنی حلق میں اٹکے ہوئے ہیں مگر وہ باہر نہیں آسکتے ہیں۔

ہمیں یہ واقعات معلوم کرنے کے بعد خود پر، پدّا پنتھلو پر، اور فلم پر بے حد افسوس ہوا اور دل ہی دل میں خیال کرتے رہے کہ کاش یہی ڈراما سیدھی سادھی زبان اور عام فہم "ہندوستانی" میں ہوتا تو نہ ہم ان کو ٹوکتے نہ وہ آسمان پر ہاتھ بلند کر کے مُنہ پھاڑتے، اور ہم معہ آڈینس کے جس میں پنتھلو جی، تانگے والے، جھٹکے والے اور معمولی قسم کے لوگ بھی شریک ہیں شروع سے آخر تک پورا فلم نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ لیتے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ اگر کوئی اچھے سے اچھا ڈراما بجائے ہندوستانی کے کسی دوسری زبان میں لکھا گیا ہے تو اُسے خاص خاص طبقہ کے لوگ پسند کر لیتے ہیں مگر عام شہرت اِسے ہرگز نصیب نہیں ہوتی ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ سب سے زیادہ ہندوستانی اور صرف ہندوستانی زبان کے ڈرامے مقبول ہوتے ہیں، چنانچہ رونق بنارسی، منشی ونائک پرشاد طالب، پنڈت نرائن پرشاد بیتاب، منشی دوار کا پرشاد اُفق، آغا حشر کاشمیری، امرت اور کاؤس جی بالی والے کے کارنامے اس زبان کی مقبولیت اور عام فہمی کے بیّن ثبوت ہیں۔

تاہم، ہم آپ کو ہندوستانی کی حیرت انگیز ہر دلعزیزی کا ثبوت مسٹر فیلڈن آل انڈیا ریڈیو ڈائرکٹر کی تحقیق سے دے سکتے ہیں جنہوں نے اس مسئلہ میں بے حد دلچسپی لی ہے۔

بحث یہ آپڑی کہ اِن کو اپنی نشر گاہوں سے کس زبان میں تقریریں اور گانے نشر کرنے چاہییں۔ جس سے ایک طرف تو چانے خانوں کے حقے اور دوسری طرف اعلیٰ ہوٹلوں کے سپید پوش اور شہر کے خوش باش دلچسپی سے سُنیں اور پسند کریں۔ اُنہوں نے سب سے اول بمبئی پریسیڈنسی کو انتخاب کیا جہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں مثلاً مرہٹی، کنڑی، گجراتی، انگریزی اور کوکنی وغیرہ وغیرہ چنانچہ انہوں نے بمبئی پریسیڈنسی میں سترہ ہزار آدمیوں کو سوال نامے بھیجے اور دریافت کیا کہ ریڈیو سُننے والے کس زبان میں تقریریں اور گانے سُننا پسند کرتے ہیں تاکہ اُسی مناسبت سے نشر گاہوں کا پروگرام مرتب کیا جائے؟

ان سترہ ہزار (۱۷۰۰۰) سوال ناموں کے جواب میں سات ہزار آدمیوں کے جواب وصول ہوئے جن میں سے دو ہزار پانچسو آدمیوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ تقریریں ہندوستانی زبان میں نشر کی جائیں [illegible] رنے انگریزی زبان کے متعلق رائے دی اور بقیہ لوگوں نے دوسری اور مختلف زبانوں کے متعلق خواہش ظاہر کی۔

اِن جوابات سے عجیب وغریب نتیجے نکالے گئے ہیں، وہ کہتا ہے کہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بہت سے ریڈیو سُننے والے جن کی مادری زبان مرہٹی یا گجراتی وغیرہ ہے وہ بھی انگریزی یا ہندوستانی زبان میں نشریات کو ترجیح دیتے ہیں۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی کو سنسکرت اور عربی کے غیر مانوس الفاظ کے حملوں سے بچایا جائے تاکہ وہ حقیقت میں ایک آسان اور عام فہم زبان بنی رہے ۔ یہ بظاہر بے حد مشکل ہے مگر اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد دکھن کے چند روشن خیال اساتذہ نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا ہے جو مشرقی زبانوں کے علاوہ یورپی زبانوں کے بھی ماہر ہیں ۔ یہ ماہرین شب و روز اسی کام میں مصروف ہیں اور انشا اللہ بہت جلد اس ساٹھ ہزار الفاظ کے خزانہ سے زیادہ سے زیادہ چند سو بنیادی الفاظ کے چالو سکّے چن لینگے جن کے ذریعہ اُردو ٹکسال میں گہما گہمی اور نئے سکّوں کی چھنا چھن سے تبادلہ خیال کی گرم بازاری رہیگی ۔

ہندوستانی فلموں کی زبان

مولوی محشر عابدی صاحب بی۔ اے، ایم۔ ایس سی (عثمانیہ) مصنف محشرستان

ہندوستان ایک ملک نہیں ہے، بلکہ یہ بہت سے چھوٹے چھوٹے ممالک کا ایک مجموعہ ہے، یہ ممالک اپنی معاشرت، جغرافی حالات، قومیت، تمدن، تہذیب اور "زبان" کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چنانچہ اگر صرف "زبان" کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں بھانت بھانت کی بولیاں اور قسم قسم کی زبانیں پائی جاتی ہیں مثلاً بنگالی، ہندی، پنجابی، سندھی، گجراتی، مرہٹی، تلنگی، ٹامل، کنڑی، وغیرہ، یہ سب زبانیں جیساکہ ان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے خاص خاص صوبوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں، مثلاً گجراتی، گجرات اور بمبئی وغیرہ میں، بنگالی بنگال میں اور پنجابی، پنجاب میں مرہٹی، صوبہ متوسط و برار میں، تلنگی، ٹامل وغیرہ دکن اور جنوبی مشرقی حصوں میں۔ ان صوبہ واری زبانوں کے ساتھ ساتھ دو اور زبانیں بھی ہر صوبہ میں رائج ہیں ایک "انگریزی" جو صرف ایک مختصر اور مخصوص تعلیم یافتہ طبقہ میں بولی جاتی ہے اور دوسری "اردو" یا "ہندوستانی" جو عوام میں کثرت سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور درحقیقت یہی وہ زبان ہے جو ہندوستان کی عام زبان (لنگوا فرانکا) کہلائی جاتی ہے اور اس کے بولنے والے ہندوستان کے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک پائے جاتے ہیں۔

یہ فطرت کا ایک اصول ہے کہ ہر شئے اپنے ماحول سے متاثر ہوتی ہے اور اس لیے فلم کمپنیوں کے لیے بھی یہ امر ناگزیر تھا کہ وہ صوبہ واری زبانوں کے اثرات قبول نہ کرتیں، اور یہی وجہ ہے کہ "فلموں" میں بھی مختلف قسم کی زبانیں اختیار کی گئی ہیں۔ اور ہندوستانی (اردو) زبان کی فلموں کے علاوہ مرہٹی، تلنگی، بنگالی اور ٹامل زبان میں بھی فلمیں تیار کی گئی ہیں۔ جو صرف خاص خاص صوبوں تک محدود ہوتی ہیں۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانی فلموں کی عام زبان کیا ہونی چاہیے اور فلم کمپنیوں کو کونسی زبانیں زیادہ فائدہ پہنچا سکتی ہیں؟

اس کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ "اردو ہی ایک ایسی زبان ہے"۔ میرا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے اس کو جانچنے کے لیے آپ فلموں کی زبان پر ناقدانہ نظر ڈال کر دیکھئے۔

صوبہ واری زبانوں کی فلمیں صرف خاص خاص صوبوں تک محدود ہوتی ہیں اور اُن سے اُسی صوبہ کے باشندے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ مثلاً بنگالی زبان کی فلمیں صوبۂ بنگال کی حد تک کامیاب ہوسکتی ہیں، پنجاب یا یو۔ پی یا دکن میں

اسس زبان کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک فلم کی زبان عوام کی سمجھ میں نہ آئے وہ اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں یا اُنہیں اُس سے کہاں تک لطف اندوز ہونے کا موقع ملیگا۔ اسی طرح "ہندی" زبان کی فلمیں جن میں بالخصوص سنسکرت کے الفاظ کی کثرت ہو، صرف یو۔پی ہی کی حد تک چل سکتی ہیں۔ وہ بھی صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں، عام اَن پڑھ اور دیہاتی اس ہندی کو نہیں سمجھ سکتے۔ ایسی ہندی زبان کی فلمیں پنجاب، مدراس اور دوسرے صوبوں میں کچھ زیادہ مفید اور کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح مرہٹی اور گجراتی زبانوں کو بھی لیا جاسکتا ہے جو سوائے گجرات سی۔پی اور بمبئی کے اور کسی صوبہ میں قطعی نہیں بولی جاتیں۔ اور۔ نہ ان زبانوں کی فلمیں دوسرے صوبوں میں چل سکتی ہیں۔

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا فلم کمپنیوں کے لیے یہ امر ضروری نہیں ہے کہ وہ ایسی فلمیں تیار کریں جن کی زبان ہندوستان کے ہر صوبہ میں، تعلیم یافتہ اور اَن پڑھ لوگ بھی سمجھ سکیں؟ یقیناً اگر تعصب کی عینک ہٹا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُسی زبان کی فلمیں کمپنیوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتی ہیں جو ہر صوبہ میں آسانی سے سمجھی جاسکیں۔ اور یہ زبان صرف "اُردو" ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کے کسی صوبہ میں چلے جائیے، خواہ وہ بمبئی ہو یا پنجاب، بنگال ہو یا یو۔پی۔ ہر جگہ آپ کو "اردو" زبان کے جاننے اور بولنے والے ملینگے اور آپ ہر صوبہ میں "اُردو" کے ذریعہ سے تبادلہ خیال کر سکینگے۔ لیکن نہ تو کسی دوسری صوبہ واری زبان میں آپ اپنا کام چلا سکتے ہیں اور نہ آپ کی "ہندی" آپ کی مشکل آسان کر سکتی ہے۔

فلم کمپنیاں صوبہ واری زبانوں میں جو فلمیں تیار کرتی ہیں وہ صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ دو صوبوں میں چل سکتی ہیں اور ان فلموں سے کمپنیوں کو جو آمدنی ہوگی وہ بھی محدود اور تھوڑی ہوگی۔ اس کے برخلاف جو فلمیں "اردو" زبان میں تیار کی جائینگی وہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں کامیابی سے چل سکینگی اور اس طرح تمام صوبوں سے جو آمدنی ہوگی وہ اُس فلم کی آمدنی سے کئی گونہ زیادہ ہوگی جو صرف "صوبہ واری" زبان میں تیار کی گئی ہوگی۔ پھر اس نقطۂ نظر سے کونسی فلم کمپنی ایسی ہے۔ جو یہ نہ چاہیگی کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرے اور اپنی فلموں سے ممکنہ منافع وصول کرے؟

میں یہ نہیں کہتا کہ صوبہ واری زبانوں میں فلمیں تیار ہی نہ کی جائیں۔ نہیں صوبہ واری ذوق اور ضروریات کے پیش نظر ان کی زبانوں میں فلمیں تیار کی جائیں لیکن جو فلمیں سارے ہندوستان کے لیے تیار کی جاتی ہیں اُن کی زبان نہایت آسان اور عام فہم ہو اور یہ کوشش کی جائے کہ ہندوستان کا ۹۹ فی صد طبقہ اس کو سمجھ سکے۔

اِس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اب ہندوستان کی فلم کمپنیوں نے اس طرف توجہ کی ہے اور وہ "ہندوستانی زبان" میں ۹۵ فی صدی فلمیں تیار کرنے لگی ہیں لیکن یہ ہندوستانی زبان خالص ہندوستانی (اُردو) نہیں ہوتی۔ اور محض تعصب کی بنا پر اس کو مشکل بنا دیا جاتا ہے اور اس میں سنسکرت کے الفاظ اس کثرت سے ٹھونس دیے جاتے ہیں کہ وہ عام لوگوں کی سمجھ سے بہت بالا ہو جاتی ہے۔ اُسے ہندوستان کا ۹۵ فی صد طبقہ سمجھ نہیں سکتا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "فلم"، خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو محض "زبان" کے سمجھ میں نہ آنے سے اس کی کامیابی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اور

اُس سے فلم کمپنیاں حسبِ منشاء فائدہ نہیں اُٹھا سکتیں۔ ان باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ضرورت اس امر کی ہے کہ فلموں میں مکالمہ ــــــــــــ کی طرف زیادہ توجہ کی جائے اور اُسے آسان اور عام فہم بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جائے۔ "روزمرّہ" کا استعمال مکالموں میں نہایت ضروری ہے، شاعرانہ تشبیہات اور استعارے بہت کم استعمال ہوں اور اگر استعمال بھی کیے جائیں تو آسان اور سُلجھے ہوئے ہوں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "ہندی زبان" جس کو یو۔پی کے چند پڑھے لکھے لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں، فلموں کی عام زبان نہیں بن سکتی کیونکہ یہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں آسانی سے سمجھی اور بولی نہیں جاتی۔ میرے اس دعوئے کا ثبوت کہ "اُردو" ہر صوبہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور "اُردو" ہی وہ زبان ہے جو ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے، اس طرح مل سکتا ہے کہ آپ خود ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جاکر دیکھیں اور "اُردو بولنے والوں" کے اعداد شمار حاصل کریں۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلموں کی زبان کا معیار کیا ہونا چاہیے اور اس میں کس قسم کی زبان کو ترجیح دی جائے؟ اس سوال کے جواب میں، میں چند فلموں کی "زبان" پر مختصراً تبصرہ کروں گا۔ تاکہ "فلموں کی زبان" کا معیار قائم ہو سکے۔ اگر آپ نے نیو تھیٹرز، بمبئی ٹاکیز، منروا موویٹون، ایسٹ انڈیا اور ساگر کی فلمیں دیکھی ہیں تو آپ خود اس کا فیصلہ کرسکتے ہیں کہ وہ کونسی فلمیں تھیں جن کی "زبان" کو ہر شخص نے پسند کیا۔ جن کی زبان ملک کے ہر صوبے میں سمجھی گئی اور جنہوں نے ملک کے ہر گوشے سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

وہ عام فہم آسان، دلکش اور پیاری زبان آپ کو "دیوداس" (نیو تھیٹرز) "جوانی کی ہوا" (بمبئی ٹاکیز) "دھوپ چھاؤں" (نیو تھیٹرز) "کروڑپتی" (نیو تھیٹرز) "پریذیڈنٹ" (نیو تھیٹرز) "ادھیکار" (نیو تھیٹرز) "خان بہادر اور جیلر" (منروا) "من موہن" (ساگر) "ایک دن کی بادشاہت" (ایسٹ انڈیا) "جیون نیا" (بمبئی ٹاکیز) "بھابی" (بمبئی ٹاکیز) "دنیا نہ مانے" (پربھات) "اُس نے کیا سوچا"، "باغبان"، "تلاشِ حق" وغیرہ میں ملتی ہیں۔ اِن فلموں میں سے دیوداس، دھوپ چھاؤں، کروڑپتی، خاں بہادر، من موہن، جوانی کی ہوا اور دنیا نہ مانے محض اپنی زبان کی صفائی، سادگی اور دلکشی کی وجہ سے سارے ہندوستان میں غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئیں اور پسند کی گئیں اور مالکانِ کمپنی کو اُمید سے زیادہ فائدہ ہوا۔ آپ اگر غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان فلموں کی زبان خالص ہندوستانی (اُردو) ہے۔ اور یہی وہ زبان ہے جو ہندوستانی فلموں کی عام زبان ہونی چاہیے۔ ان فلموں کی زبان کو آپ سمجھتے بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان سے زیادہ سے زیادہ لطف بھی اُٹھاتے ہیں۔ فلم دھوپ چھاؤں (نیو تھیٹرز) سے جو "اردو" زبان میں تھی، مالکان کمپنی کو جس قدر آمدنی ہوئی ہے۔ وہ ان کی توقعات سے کئی گونہ زیادہ تھی۔ اور صرف صوبہ بمبئی میں اُس فلم کی آمدنی ایک لاکھ سے متجاوز ہو چکی تھی۔

اِن فلموں کی چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں، جن کی زبان سنسکرت کی زیادتی کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے

زیادہ دشوار بن گئی ہے اور وہ بہت مشکل قسم کی ہندی کہلاتی ہے جسے صرف تھوڑے سے تعلیم یافتہ لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ودیاپتی" جیسی بلند پایہ فلم بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ پربھات کی فلمیں مثلاً امرت منتھن، امرجیوتی، وہاں، وغیرہ، نیوتھیٹرز کی فلمیں، پورن بھگت، چندی داس، پجارن وغیرہ، رنجیت کی فلمیں، ایسٹ انڈیا کی فلمیں بالخصوص سیتا وغیرہ، بمبئی ٹاکیز کا "وچن" ان کے علاوہ ہندوستان کی بے شمار فلم کمپنیاں ایسی ہیں جو عام فہم زبان کو خواہ مخواہ سنسکرت اور ہندی کے غیر مانوس الفاظ کی بھرمار سے مشکل اور ناقابل فہم بناتی ہیں۔ اور روزمرہ کی عام زبان (اردو) کو ترک کرکے ایک نئی زبان پیش کرتی ہیں۔ جو نہ تو ہندوستانی ہوتی ہے۔ نہ اردو نہ ہندی۔

چند ایسے الفاظ جو روزمرہ میں استعمال نہیں ہوتے اور صرف فلموں میں داخل کیے جاتے ہیں یہ ہیں۔ سہاگ، آشیرباد، وشا، شکتی، آتما، پراشچت، بھگتی، شوبھ، سنتوش، کارن، سیناپتی، مہامنتری، ٹھکشا، بلیدان، اپسرا، کشالیش، شبد، وغیرہ، بعض فلموں کے مکالموں میں اکثر بڑے بڑے عربی اور فارسی کے الفاظ آجاتے ہیں جو عام لوگوں کے لیے کسی قدر مشکل ہو جاتے ہیں اس لیے ایسے الفاظ کے استعمال سے بھی حتی الامکان مکالمہ نہ کرنا چاہیے۔ مثلاً گلشنِ بے خزاں کی بہار، عرضداشت، تشریف، عقلمند، حرفِ غلط، موجوں کا ترنم، نسیم کے جھونکے وغیرہ،

گانے عموماً آسان ہندی ملی ہوئی اردو میں زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے راگوں میں ایک دلکشی اور ایک مٹھاس ہوتی ہے۔ اور یہ آسانی سے سب کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مثلاً بمبئی ٹاکیز کے "بھابی" نامی فلم کا ایک گانا درج ذیل ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بن تتلی۔ بن تتلی

میں پھول پھول پر جاتی، رس پاتی، اُڑ جاتی، بن تتلی۔ بن تتلی۔

اک پھول سے بات بتاتی، دوجے کو رنگ روپ دکھاتی، دونوں سے رس پاتی، اُڑ جاتی۔ بن تتلی۔

ایک، دو، تین، چار، پان، چھے، سات، آٹھ۔ سب کو دیتی ایک ہی پاٹھ۔ مسکاتی، من بھاتی، رس پاتی، اُڑ جاتی۔ بن تتلی یا ودیاپتی میں کے۔ سی ڈے (مدھوسودن) ایک جگہ گاتا ہے۔ گوکل سے گئے گردھاری، ہوئی سونی نگری ساری۔ جت دیکھو اُت چھائی اُداسی، روت ہیں نرناری وغیرہ۔

فلموں میں غزلیں بھی گائی جاتی ہیں۔ لیکن اکثر غزلیں مشکل ہوتی ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو آسان سے آسان بنا کر پیش کیا جائے۔ مثلاً "یہودی کی لڑکی" میں غالب کی ایک غزل جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے:۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

عام فہم نہیں ہے اور صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح "اس نے کیا سوچا" نامی فلم میں غالب کی ایک غزل کو کئی افراد نے گایا ہے۔ جس کا شعر یہ ہے:۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی ہے

ذرا دشوار ہے۔ البتہ مندرجہ ذیل غزل جو "پجارن" (نیو تھیٹرز) سے لی گئی ہے بہت آسان ہے۔

جو بیت چکی، سو بیت چکی، اب اسکی یاد ستائے کیوں
خوش رہنے والی صورت پر چنتا کی بدلی چھائے کیوں

پھولوں سے جس کو نفرت ہو اسکی خوشبو سے وحشت ہو
جس دل کی مچلنا عادت ہو، پھر کوئی اُسے بہلائے کیوں

آخر میں، میں مسٹر سدرشن (نیو تھیٹرز کے مکالمہ نویس اور افسانہ نگار) کے ایک مضمون "ہندوستانی فلموں کی زبان" (مطبوعہ "عکاس" کلکتہ جنوری ۱۹۴۲ء) کا اقتباس درج کرکے ختم کرتا ہوں۔ مسٹر سدرشن نے بھی "فلموں کی زبان" وہی بتائی ہے جس کو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"ہمیں ہندوستان کے لیے اس وقت ایک ایسی آسان زبان کی ضرورت ہے جس میں نہ فارسی اور عربی کے ادق الفاظ کی بھرمار ہو نہ سنسکرت کے موٹے موٹے اور ثقیل شبدوں کی ٹھونس ٹھانس۔ آسان اور حسین الفاظ دونوں زبانوں سے لے لئے جائیں۔ مشکل اور بھدے الفاظ دونوں زبانوں کے ٹھکرا دیے جائیں اور اس طرح ایک ایسی زود فہم اور آسان زبان تیار کرلی جائے جو ہندوستان کے بچے بچے کے منہ میں بیٹھ سکے۔ یہی ہندوستانی ہماری فلمی زبان ہونی چاہیے۔ میرا دماغ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایسی ملی جلی اور حسین زبان کے اوپر کسی کو اعتراض کی اُنگلی اٹھانے کی کیونکر جرأت ہوسکتی ہے۔ ایک ہندی پریمی کہتا ہے:۔

"اسینتھ بھاشن کے پاٹھ کوئی تم سے پڑھ لے۔ مجھے کس کس پرکار ٹھگتے رہے ہیں کہتے تھے ہم پاشان کے بیوپاری ہیں۔" مگر اسے کے فی صدی مسلمان سمجھینگے؟ کوئی اُردو کا عاشق اس خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کریگا۔ "کذب وافترا کے اسباق کوئی تم سے پڑھ لے۔ مجھے انواع واقسام کے طریقوں سے گمراہ کرتے رہے ہیں۔ کہتے تھے ہم پتھروں کے تاجر ہیں۔

اب بتائیے اسے عام ہندو سمجھ سکتا ہے؟

مگر ہندوستانی زبان اسے یوں کہیگی۔ "جھوٹ بولنا کوئی آپ سے سیکھ لے۔ مجھے کیسے کیسے دھوکے دیتے رہے ہیں۔ کہتے تھے ہم پتھروں کے سوداگر ہیں۔"

یقیناً اسے ہندو اور مسلمان دونوں سمجھ سکتے ہیں۔ دونوں کو کسی لفظ کے معنے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور دونوں کے لیے زبان کا چٹخارہ بھی اس میں موجود ہے۔"

مسٹر سدرشن کی "ہندوستانی" کو ہم آسان اور عام فہم اردو کہتے ہیں۔ اور یہی ہماری فلموں کی زبان ہونی چاہیے۔

فلمی خبریں NEWS AND VIEWS

پربھات فلم کمپنی۔ مشہور ڈائرکٹر شانتا رام کے چھوٹے بھائی کا انتقال ہوگیا جس کا شانتا رام کو بے حد صدمہ ہے اور اس حادثہ سے یہ اتنے متاثر ہوئے کہ کاروبار بند کردیے۔ مگر اب صحت درست ہونے کی وجہ سے ''آدمی'' نامی فلم تیار کر رہے ہیں اور اس میں شانتا بھائی ہبلیکر ہیروین کی حیثیت سے پیش کی جارہی ہے۔ فتح لال اور ڈاملے نے ''سنت گیانیشوری'' کے چند مناظر مکمل کرلیے ہیں، جس کی خاص ادا کار شانتا آپٹے ہے۔ اور ''وسنت سینا'' کی تشہیر زوروں پر کی جارہی ہے۔

نیوتھیٹرز۔ امر ملک کی فلم ''بڑی دیدی'' کے پرنٹس نمائش کے لیے شمالی ہند میں بھیج دیے گئے ہیں۔ ''دشمن'' کے ختم ہوتے ہی یہ فلم دہلی اور یوپی کے مختلف مقامات پر دکھائی جائیگی۔ دیوکی بوس ''سپیرا'' کے آخری مناظر لے رہے ہیں۔ یہ فلم اوائل مئی تک یقیناً مکمل ہو جائیگی اس کا نمونہ بھی تیار ہوگیا ہے۔ ''کپال کنڈلا'' عنقریب پیش کیا جائیگا۔ ''راج رانی میرا'' پنجابی زبان میں بن رہا ہے۔

ساگر موویٹون۔ نندلعل کی سوشیل فلم نمائش کے لیے تیار ہے اس میں سریندر، مایا اور ہریش نے کام کیا ہے۔ وریندر دیسائی ''سادھنا'' مکمل کرچکے ہیں۔ محبوب نے ''ایک ہی راستہ'' نامی فلم ختم کرنے کے بعد ''علی بابا'' کی کہانی کو پنجابی اور اردو میں بنانا شروع کردیا ہے۔ پنجابی فلم میں غلام محمد، سریندر، سردار اختر اور وحیدن کام کرینگے۔ علی بابا کے قصہ نگار اے آر۔ کاردار ہیں اور پنجابی مکالمے لالہ یعقوب اور اردو مکالمے ضیا سرحدی لکھ رہے ہیں۔

رنجیت موویٹون کی حالیہ فلم ''ٹھوکر'' دہلی اور کراچی میں غیر معمولی طور پر پسند کی جارہی ہے۔ چمنت دیسائی کی ہندی فلم ''تلسی داس'' اور مدھوک کی پنجابی فلم ''مرزا صاحباں''، بمبئی اور لاہور میں اسی ماہ سے دکھائی جائیگی۔ ''خوش نصیب'' آدھے سے زیادہ بن چکا ہے۔ مالکان کمپنی آئندہ تلنگی فلمیں تیار کرنے کی فکر میں ہیں۔

بمبئی ٹاکیز۔ ''نوجیون''، راکسی ٹاکیز بمبئی میں نہایت کامیابی سے چل رہی ہے دوسری سوشیل فلم کی شوٹنگ بھی شروع کردی گئی ہے۔ کیشیپ کے الگ ہوجانے سے پنڈت نروتم ویاس اس کے مکالمے لکھ رہے ہیں۔ نروتم ویاس وہی ہیں جو اس سے قبل دیوکی بوس کے سیتا، راج رانی میرا، انقلاب، جیون ناٹک اور پربھات کے امرجوتی، نیز رام موویٹون کے سنہرا بال نامی فلم کے مکالمے تحریر کرچکے ہیں۔

منروا مووی ٹون ۔ "پکار" نمایش کے لیے تیار ہے ۔ اس کا افسانہ عہد مغلیہ سے تعلق رکھتا ہے اور شہنشاہ جہانگیر کی زندگی کے واقعات پیش کیے گئے ہیں اداکاروں میں سہراب مودی، چندر موہن، صادق علی، نسیم، سردار اختر اور شہلا کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ پربھات کے سابق ڈائرکٹر کیشوراؤ دھائبر نے "سیواجی جنم" مکمل کر لیا ہے ۔ گنجا نند جاگیردار ایک سماجی فلم تیار کر رہے ہیں ۔ سہراب مودی نے بھی اپنے فلم کی شوٹنگ شروع کر دی ہے ۔

فلم سٹی کے مالکان نے مشہور ساونڈ انجینیر اروڑا کی نگرانی میں ایک مختصر رنگین فلم تیار کرایا ہے ۔ پلاٹ میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ۔ وہ ساری بچوں کی دلچسپی اور تفریحی واقعات پر مبنی ہیں ۔ اس کے ممثلین خود بچے ہیں ۔

ہلال پکچرس ۔ سلطان صلاح الدین کی ابتدائی تیاریاں عمل میں لائی جارہی ہیں ۔ اس کے مکالمے مشہور ادیب حکیم احمد شجاع نے لکھے ہیں! اداکاروں میں رتن بائی، غلام محمد، انصاری، جینت ۔ کے، ین سنگھ، ڈبلیو ایم خاں، مرزا مشرف، محمد اسحاق اور للیتا دیوی کے نام سنے جا رہے ہیں ۔

واڈیا مووی ٹون کی فلم "جنگل کنگ" کی نمایش لیمنگٹن ٹاکیز بمبئی میں ہو رہی ہے ۔ اس میں پرمیلا، گلشن، آغا جانی، نادیر، شاہنواز، چندر شیکھر وغیرہ نے کام کیا ہے نیز اس میں "اسٹیٹ اکسپرس" کا ہیرو بھی شامل ہے ۔ "وجے کمار" اور "تیری منزل کہاں ہے" نمایش کے لیے تیار ہے ۔ ہومی واڈیا "پنجاب میل" کے آخری مناظر لے رہے ہیں ۔ اس میں ناڈیا، سردار منصور، بہمن شراف اور ستارا کا کام قابلِ دید ہے ۔

موہن پکچرس ۔ "ڈینٹ میل"، امپیریل ٹاکیز اور "رتنا لٹاری" گلوب ٹاکیز بمبئی میں دکھائے جارہے ہیں ۔ ڈینٹ میل میں یاسمین، اندو رانی گلاب، نذیر، چندر کانت، غلام قادر، وغیرہ نے کام کیا ہے اور رتنا لٹاری میں رومیلا، کانتا، مہدی رضا، سلطان عالم شریک ہیں ۔ یہ دونوں فلمیں موہن پکچرس کی سابقہ فلموں سے کہیں زیادہ بہتر ہیں ۔ "بھیدی کمارن" اور "رن سنگرام" نمایش کے لیے تیار ہیں ۔ اے ۔ یم خاں نے "چلتا پرزہ" مکمل کر لیا ہے ۔ ڈائرکٹر صفدر "چشمہ والی" کے آخری مناظر شوٹ کر رہے ہیں ۔ اور موہن سنگھ اپنی معاشرتی کہانی کے فلمانے میں مصروف ہیں ۔ یہ کمپنی آئندہ سے ٹامل فلمیں بھی تیار کریگی ۔ چنانچہ مزید مشنیری خریدی گئی ہے ۔ اور بہترین اداکاروں کو منتخب کیا جا رہا ہے ۔

ونراج پکچرس ۔ اس کمپنی کی بنیاد ہری بھائی دوے نے ڈالی ہے ۔ جو اس سے قبل اجیت مودی ٹون کے ذریعہ "شاہی لٹیرا"، "ٹائپسٹ گرل"، اور "چاند سلطانہ" پیش کر چکے ہیں ۔ اب اس کمپنی کی پہلی فلم "وطن" کی ابتدائی تیاریاں عمل میں آئی ہیں اس میں ہرشیو دیسائی، زیں چندرا اور گوپ کام کر رہے ہیں ۔

افکار و آرا

اسٹریٹ سنگر (بازاری گویا) نیو تھیٹرز کا مقبول عام فلم جو شنبہ ۸ ؍ اپریل سے پیلیس ٹاکیز میں دکھایا جائیگا۔ یہ فلم ہندوستانی فلم سازی کی ترقی کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ نیو تھیٹرز کی بلند خیالی اور کامیابی کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنے اعلیٰ ترین فلموں کے باعث ایک ممتاز جگہ حاصل کرلی ہے۔ اور اس دفعہ ایک زبردست موضوع کو فلمی جامہ پہنایا ہے۔ اس کا قصہ مقصدی ہے اور بیش قیمت خیالات سے مملو ہے۔ اور اپنے طرز کی پہلی کوشش ہے۔ اس میں دو بازاری گانے والوں کی زندگی دکھائی گئی ہے اور روزمرہ کے نشیب و فراز کو نہایت عمدگی سے واضح کیا ہے۔ اس فلم کی قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ ہر طبقہ کی دلچسپی کے سامان مہیا ہیں۔ اس خیالی قصہ کی اُٹھان ایسی ہے کہ گذرنے والے واقعات حقیقت کا رنگ اختیار کرلیتے ہیں۔ اداکاری بہتر۔ مناظر دلکش۔ واقعات مسلسل۔ موسیقی، قیامت خیز۔ اور تڑپ پیدا کرنے والے مکالمے، ایک خاص کیفیت پیدا کرتے ہیں، خصوصاً کننن بالا اور سہگل کے گانے جانِ فلم ہیں۔ عوام کا خیال اور اخبارات کی رائے ہے کہ یہ فلم نیو تھیٹرز کی دیگر فلموں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

برہمچاری اور ٹھوکر۔ برہمچاری میجسٹک ٹاکیز دہلی اور ٹھوکر ناولٹی ٹاکیز دہلی میں نمائش پا رہے ہیں۔ برہمچاری بمبئی کی طرح وہاں بھی مقبول ہے۔ اور کار دار کی ٹھوکر باغبان سے زیادہ پسند کی جارہی ہے۔ یعنے ٹھوکر فی الواقعی "ٹھوکر" ہے!! جو عنقریب حیدرآباد کے زمرد محل ٹاکیز میں دکھائی جائیگی۔

بھابی۔ ایک طویل انتظار کے بعد بمبئی ٹاکیز کے مشہور و معروف فلم بھابی کے اشتہارات دیکھنے میں آرہے ہیں۔ عنقریب یہ شہکار حیدرآباد کے ممتاز سنیما پیلیس ٹاکیز میں دکھایا جائیگا۔ کہا جاتا ہے کہ بھابی ایک انقلابی فلم ہے۔ اور اس سے بمبئی ٹاکیز کی شہرت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ بھابی کا پلاٹ عام قصص سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نہ صرف ظرافت سے معمور ہے۔ بلکہ موسیقی اور اداکاری وغیرہ کے اعتبار سے غیر معمولی خصوصیات کا حامل ہے۔

لیڈیز اونلی۔ یاتھے سنیما بمبئی میں دکھائی جارہی ہے۔ جسے سب پسند کر رہے ہیں۔ اس کی قبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہوسکتا ہے کہ بمبئی میں مسلسل چھ ہفتوں سے چل رہی ہے۔ عوام اس کی موسیقی اور اداکاری سے زیادہ پلاٹ سے محظوظ ہو رہے ہیں۔

(مصوّر)

ہفتہ وار باتصویر رسالہ۔ جو مشہور ادیب نذیر لدھیانوی کی ادارت میں بمبئی سے شایع ہو رہا ہے اس میں مشاہیر ملک کے بلند پایہ علمی، ادبی اور تاریخی مضامین درج ہوا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تازہ فلمی خبریں اور ہندوستانی صنعت فلم پر بے لاگ تنقیدیں۔ یہ رسالہ صنعت فلم سے متعلق اردو زبان میں اپنی طرز کا پہلا ہے۔ اس کے ہر پرچے میں بے شمار تصاویر شامل رہتے ہیں تقطیع بڑی۔ ایک سال میں اس میں جو مضامین وغیرہ دیے جاتے ہیں۔ ان کے صفحات کی مجموعی تعداد تقریباً تین ہزار اور تصاویر کی ایک ہزار۔ باوجود اس کے قیمت نہایت قلیل یعنی سالانہ پانچ روپیہ مقرر ہے۔ ہندوستان کے عرض و طول میں اس کی کثیر ایجنسیاں قائم ہیں۔ اور ویلر بک اسٹال پر فروخت ہوتا ہے۔ اس میں اشتہار دینا عین کامیابی ہے۔ اس لیے کہ اس کے پڑھنے والے تقریباً دس لاکھ ہیں۔

Professor Agha Sayyid Mohammad Ali Dar ul Islam is a great poet and author. His Dictionary *Farhang-e Nizam* is best work of this century about which all orientalists think that such a complete Dictionary has not been written till now.

The *Emperor of Persia* has conferred on him *first class Nishan-e Ilmi* for this book and this is an honour which is probably conferred on Agha Sahib first. Agha Sahib knows nine languages classical *Sanskrit*, *Zend* and *Pazend*.

In this number we publish an article by him *what language will suit Indian Films most?*

Nishan-e Ilmi first class, which has been conferred on Sayyid Mohammad Ali Dar ul Islam by the *Emperor of Persia*.

Effect of Terrorism on Cinema Fans.

Quite recently, as a sign of terrorism and violence a few *Bomb explosions* took place in Hyderabad resulting in two deaths and several injuries. A sensation has prevailed among the citizens. The police has been doing its utmost to maintain quiet and peace and has succeeded in capturing a few terrorists involved in *the bomb-conspiracy*.

These accidents have affected, indirectly, the income of the Cinema-houses very badly. People are, naturally frightened and do not attend the second shows the result being a great fall in the Cinema income. This sort of terrorism is not the right method of serving the country and the nation on the contrary, it leads to destruction and disorder loss of peace and loss of life.

The Educative Value of the Film

By

K. Clement-Jones M.R.A.S. (London)

Sometime Tutor to the Prince Salabat Jah Bahadur and Basalat Jah Bahadur,
Member S. S. Qadri Medal Committee

Cinema fans are to be found by the thousand in Hyderabad. Some go to "kill time", others to have a thrill, and others again to learn a moral to adorn a tale. Some plays act as a stimulant, and others as an opiate, but the plays that have the greatest educative effect are those which engender patriotism in the individual to work for the uplift of the industrial, agricultural, social and moral welfare of the citizens of the State. Patriotism of the variety prevalent a century ago, which bristled with jingoism is not only futile, but actually wicked, and has been and will be manipulated by financiers, politicians, and film-producers to meet their own ends. It was of this variety which made Dr. Johnson say, "Patriotism is the last refuge of a scoundrel. It is a truism that ideas and not force should dominate the world".

What are called the actualities of life are shown on the screen, the bombing of towns, the use of gas to maim and injure not only the actual fighters, but the peaceful workers in fields and factories.

Psychology of the mob and of the individual plays an important part in the production of a film. Psychologists tell us that the public is fascinated with a tragedy, because it represents the actual troubles of the individual and that man like the animal has a struggle for existence, and is born just to die. But the effect on the audience of a succession of tragedies, is most unwholesome, because India, where the population takes life most seriously, the larger number of pictures should be comedies.

Paul Muni has won golden opinions for his films "The Story of Louis Pasteur" and "The Life of Emile Zola". Similar films depicting the life of Mr. Ghandi, Sir Mohamed Iqbal, Atta Turk etc., will draw large houses and at the same time have an educative influence.

It is desirable that these films should be shown with Urdu as the language of instruction, because it is most widely known.

OURSELVES

The first issue of the 'Film' was received with great enthusiasm by the public, for which we offer our heart-felt thanks. It is a matter of great pleasure that within such a short time the sales have reached a satisfactory basis, which convinces us of its success in the future. Although money is lavishly spent on its publication, the price has been fixed so low as to enable every person, interested with the movies, to purchase it, for it is our aim to give the journal a wide publicity and place it in the hands of these also who are connoisseurs of the art. Let us assure the readers that the Journal's management is in such responsible hands that there is no fear of its being stopped. The managing staff is bent upon making a success. But if it is correct that every enterprise requires some patronage, we expect our well-wishers and countrymen to give us a helping hand by generously patronizing the Journal.

It is unnecessary here to enumerate the orders that have reached us from outside of India, for the present we have given the agency of the Journal to Messers Luzack & Company, the famous London Booksellers.

Our first issue was devoted to *What language will suit the Indian Films most?*, and many useful contributions have been received that will be published in the coming issues, our next subject to which we want to draw the attention of our writers is, *What sort of films does India want?* We request our writers to kindly send us their contributions in English and Urdu both, at their earliest convenience.

The Film Journalists Association of India.

On March 16th, 1939, a few Bombay Journalists gathered in the office of *Film India*, Bombay and formed *the Film Journalists Association of India*, Babu Rao Patel, editor of the Film India being elected as President. The Association consists of two Vice-Presidents, two joint Secretaries, eight members and a treasurer. Mr. Kirpa Ram, editor of the *Movies* Delhi represents U.P. and Mr. L. C. Bhalla Madras. Mr. Ram Baghai, is in charge of Hollywood Correspondence. Mr. P. G. Bhagwat has been made the Hon. Auditor.

This is an appreciable step taken by the Bombay Journalists, and we support its aims and aspirations. At the same time it will not be out of place to remind this Association of the great work of Urdu (Hindustani) Journalism done to the cause of Indian Film Industry. While it was in its infancy it was Urdu (Hindustani) which nourished it and made it what it is today. It is a matter of regret that none of the Urdu (Hindustani) Film Journalists of India has been asked to join this association.

As this association consists only of the film Journalists, we want to draw the attention of the President to some of the famous energetic Urdu (Hindustani) Film Journalists mentioned below, who have been propagating a lot for the progress and furtherence of the Industry.

1. Ovais Ahmed Esqr. B.A. (Hons), M.A.
2. Mahsher Abidi Esqr. B.A., M.Sc.
3. Mr. Masood Sabiri.
4. Zafer Tabrezi.
5. Mahboob Tarzi.
6. Y. K. Tariq.
7. Khwaja Qadwai.
8. Latif Ahmed Uluvi.
9. Basheer Hindi.

پیلیس ٹاکیز

نیو تھیٹرز کا شہرۂ آفاق فلم

اسٹریٹ سنگر

(بازاری گویا)

یہ ایک بہت ہی اچھا اور سبق آموز فلم ہے۔ اسکی داستان اتنی پرتاثیر ہے کہ انسان اپنے آپ مین کھو جاتا ہے — اس کا ہر شعر نشتر اور موسیقی سحر ہے

اس فلم مین نیو تھیٹرز نے فن موسیقی کو زندہ جاوید کر دیا ہے —

سہگل اور کنن بالا اس کے خاص اداکار ہین —

ان کے علاوہ جگدیش۔ بکرم کپور۔ رام کماری وغیرہ بھی ہین۔

STREET SINGER
स्ट्रीट सिंगर
اسٹریٹ سنگر
DIRECTION
MZUMDAR
PHA
CA
GAL,
DISH,
OOR,
KUMAR
PHOTOGRAPH
SUDHIS
LOKEN
MUSIC –
R. C. BORA

ALWAYS USE PURE VEGETABLE OILS.

AWARDED GOLD MEDALS

Sold in 4 oz Bottle

London

Bangalore

Mysore

Bhongir Jidcal Nalgunda

Sold in 4 oz Bottle

Nizam Vegetable Hair Oil.

By Special Appointment to
H E H The Nizam of
Hyderabad Deccan and Berar

It is Hoped That The Public Who Are Used To the Best English Hair Oils Will Now Look up to This Boon, of Which The Advantages Are Self Evident in One Trial.

Beware of Using Cheap Harmful Oils.

Calicut

Deccan Hair Oil.

Analysed and Passed By
H E H The Nizam's Govt
Laboratory

It Strengthens The Nerves of the Brain of Students and of All Brain Workers. Also Guaranteed To Prevent The Hair From Falling.

Beware of Using Cheap Harmful Oils.

GOLDEN SNOW

WORTH ITS WEIGHT IN GOLD. A REAL BEAUTY SECRET.

DECCAN HAIR CREAM

With all its Medicinal properties, Perfumed splendour and graduating delicacy comes supreme in the Cream Market

MANUFACTURED BY

The Deccan Hair Oil Company

By Special Appointment to H.E.H. The Nizam of

HYDERABAD-Dn. & BERAR.

THE FILM

A FORTNIGHTLY BILINGUAL JOURNAL OF SAYYID SA'AD ULLAH QADRI MEDAL COMMITTEE

Vol.1., No. 2. *Hyderabad-Deccan* 5 April 1939

HON'BLE NAWAB JUSTICE NAZIR YAR JUNG BAHADUR
M.A. (Alig.), LL.D. (Cantab.), Barrister-at-Law.
Member, S. S. Qadri, Medal Committee.
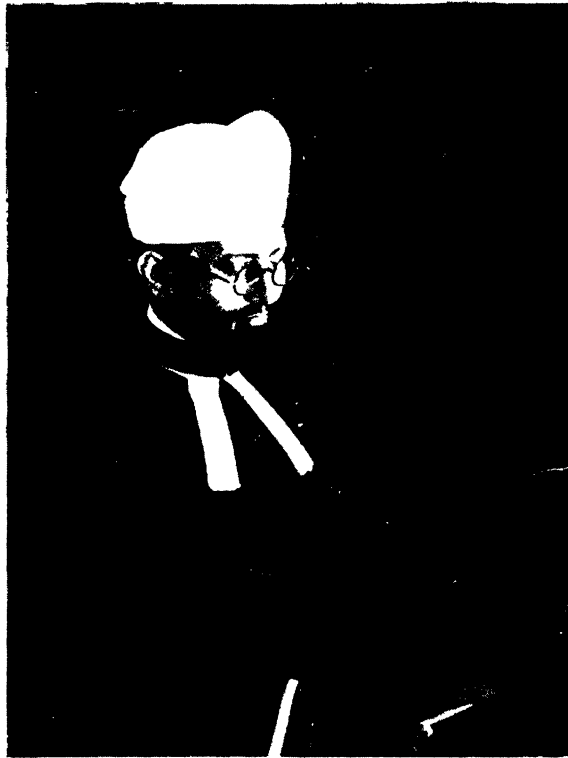
Annual Subscription Rs. 4.

Per Copy -/2/-

Printed at the Osmania University Press

کدایش گاری اور جگدیش
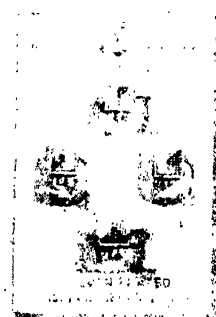
ٹریڈ مارک
TRADE MARK
سلطنت آصفیہ کی واحد صنعت
DECCAN BUTTON FACTORY
دکن بٹن فیکٹری
THE DECCAN BUTTON FACTORY
HYDERABAD. (DECCAN).

مقامی سینماؤں کی سیر

مقیاس فلم

FILM OFFICE
HYDERABAD (DN)

فلم	درجہ
ودیاپتی	نہایت اچھا
پکار	اچھا
مکتی	کسی قدر اچھا
سادھنا	اوسط
دیوبالا	لغو

S. ABDUR RAZZACK
& Co. CHEMESTS TO
H.E.H. THE NIZAM
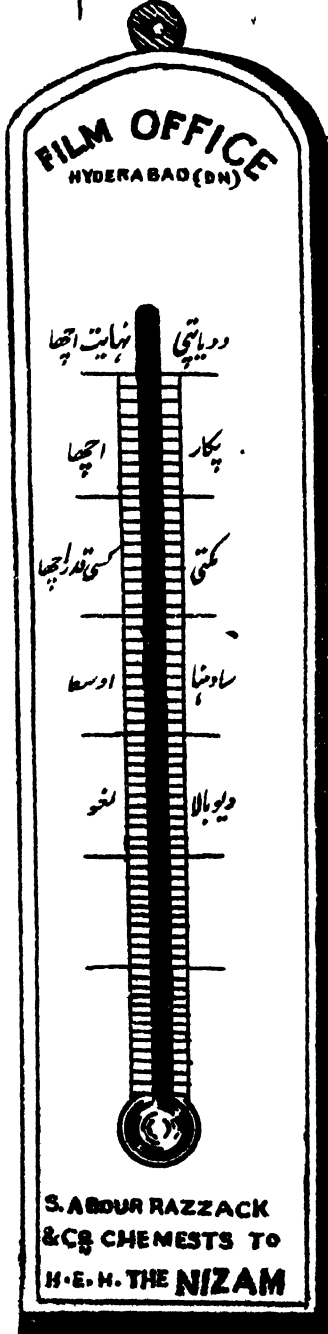
	سینما کا نام	محل وقوع	سینما چلانے والے کا نام	کونسا فلم چل رہا ہے	کس کمپنی کا ہے
۱	سلکٹ ٹاکیز	نیا پل	انبالال پٹیل اور بھگت سنگھ	سادھنا	ساگر
۲	زمرد محل	مصطفیٰ بازار	″ ″ ″	مکتی	نیو تھیٹرز
۳	ساگر ٹاکیز	ترپ بازار	″ ″ ″	مالا پلا	
۴	پیلس ٹاکیز	عابد روڈ	″ ″ ″		
۵	ویسٹنڈ ٹاکیز	کاچی گوڑہ			
۶	رائل سینما	سلطان بازار	وینیار وینشاہ	اسیر عشق	پراموٹ
۷	کرشنا ٹاکیز	مچھلی کمان	″ ″	دیوبالا	جے بھارت
۸	نشاط ٹاکیز	جام باغ	رستم مودی	پکار	منروا
۹	دلشاد ٹاکیز	سلطان بازار	قاسم علی فاضل		
۱۰	منروا سینما	چادر گھاٹ	زیر تعمیر ہے —		

ایڈیٹوریل

صنعت فلم کی نسبت مہاتما گاندھی کا پیام

مہاتما گاندھی نے ابھی حال میں سینما کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اُن کا ماحصل یہ ہے کہ متحرک تصاویر عیاشی کا واحد ذریعہ ہیں اور اُن کی دانست میں صنعت فلم بھی قمار بازی، ریس اور سٹہ کے قبیل کی ایک بدترین صنف ہے جسے ہندوستان سے حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہیئے۔

وہ لوگ جو اس سے وابستہ ہیں یا وہ جو اسکی خیر مناتے ہیں اُن کے قلوب پر مہاتما کے اِن ارشادات سے کاری ضرب لگی ہوگی۔ بہر حال اہل ہند کے لئے دو راہیں کھلی ہوئی ہیں —— ایک یہ کہ اس پر عمل کر کے صنعت فلم کو ہندوستان سے نیست و نابود کر دیں —— دوسری یہ کہ مہاتما کے اس حقیقت افروز بیان کی مخالفت کی جائے۔

سینما اور ٹکس
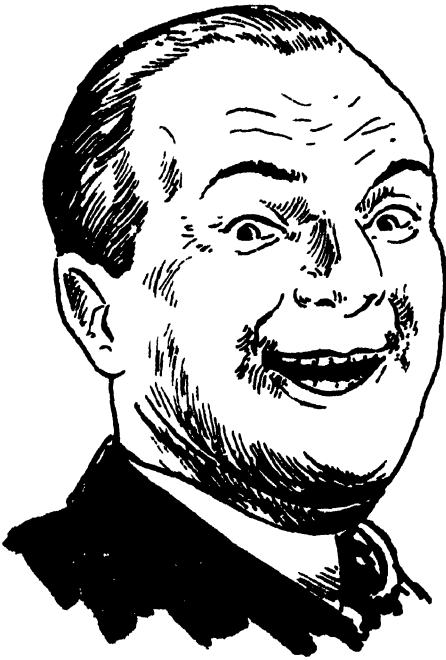
جسطرح برٹش انڈیا اور دیگر دیسی ریاستوں میں سینما کے ٹکٹوں پر ٹکس لگائے جاتے ہیں اسی طرح ہماری حکومت کو بھی چاہیئے کہ وہ جملہ سینماؤں کے فروخت شدہ ٹکٹوں پر ہلکے ہلکے ٹکس عائد کرے۔ اِس سے ایک تو بلدیہ کی آمدنی میں توفیر ہوگی دوسرے بلدیہ رفاہی خدمات اب سے زیادہ اعلیٰ پیمانہ پر بجا لا سکے گا۔ دراصل ملک کی ترقی عوام کے تعاون و اشتراک پر موقوف ہے۔

ولیسٹنڈ ٹاکیز کی مسدودی

یہ بلدہ کا خوشنما سینما ہے جو شہر سے کچھ دور۔ مگر ایک فرحت بخش مقام پر —— جہاں آبادی کا تناسب کم اور ذرائع مرور و عبور دشوار ہیں —— واقع ہے۔

مسٹر دینیارجی وین شاہ اور مسٹر مودی اِسے ایک عرصہ تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلاتے رہے۔ مگر ماہِ رواں اسکے لئے کچھ نامبارک ثابت ہوا۔ جب ہی یہ سینما بند ہوگیا۔ سب سے آخری فلم جو اسمیں چلی، وشنو سینٹون کی مسلم آزار تصویر "ایماندار" تھی!

نشاط ٹاکیز

قدیم سنٹرل سینما کا دوسرا نام ہے۔ نام کی تبدیلی کے علاوہ اسکی ہیئت ترکیبی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور اب بھی وہ بلحاظ تعمیر ہمارے ملک کا ایک تھرڈ کلاس سینما ہے۔ جب موتی محل ٹاکیز کو آگ لگی تو حکومت نے اسکی حالت کو مخدوش پا کر فوراً بند کرا دیا تھا۔ سنا گیا کہ بعد کو اسمیں ترمیم ہوئی اور حکومت نے اطمینان کرنے کے بعد دوبارہ اجازت دیدی۔ اجازت کے بعد

بقیہ صفحہ ۱۱

ایک جدید سینما کا اضافہ

سلطان بازار میں ایک نیا سینما "پریم تھیٹر" کی سابقہ بنیادوں پر ابھی حال میں تعمیر ہوا ہے۔ جسکا نام "دل شاد ٹاکیز" ہے۔ اسکی عمارت نہایت اعلیٰ قسم کی ہے مسٹر قاسم علی فاضل نے اسے دو ہزار ماہوار کرایہ پر لیا ہے اور غالباً عید رمضان کے مبارک و مسعود موقع پر اسکا افتتاح کرنے والے ہیں۔ اس کے بعد "پیلیس" مسٹر فاضل کے اہتمام سے نکل کر ڈاکٹر پٹیل اور مسٹر بھگت سنگھ کے قبضہ میں چلا جائے گا۔

ہم اس نئے سینما کی تعمیر پر اظہار مسرت کرتے ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ یہ واضح کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ حیدرآباد کو اب جدید سینماؤں کی قطعاً ضرورت نہیں رہی ہے۔ اسلئے کہ حیدرآباد میں کافی سے زیادہ سینما پہلے ہی سے موجود ہیں!

مسٹر قاسم علی فاضل نے اس نومولود سینما کا نام "دلشاد ٹاکیز" رکھا ہے نہیں معلوم انھیں اس نام میں ایسی کونسی دلکشی اور دلفریبی نظر آئی؟ — بظاہر یہ نام ایسے شاندار سینما کے شایان شان معلوم نہیں ہوتا ——— اگر "دلشاد" کے بجائے اس سینما کا نام "شاد ٹاکیز" رکھا جاتا تو بہتر تھا۔ اس سے سینمائی مفہوم پورا ہونے کے علاوہ اس سینما کو ہمارے ہر دلعزیز سر مہاراجہ بہادر کی سرپرستی اور خوشنودی بھی حاصل ہو جاتی۔

ہم مسٹر قاسم علی فاضل کو جدید سینما کے حصول پر مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا انہیں ایسی نفع دے کیونکہ وہ رقیبوں کی بدولت بہت کچھ کھو چکے ہیں!!!

ڈرم

یہ فلم چند ماہ قبل ڈریلیمنٹ ٹاکیز سکندرآباد اور رائل سینما حیدرآباد میں دکھائی گئی تھی۔ اخبار آزاد (غازی آباد) مورخہ ۱۴ر اکتوبر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سی، پی اور برار کی حکومت نے اپنی قلمرو میں اسکی نمائش ممنوع قرار دی ہے۔

پرستان پارک

چند روز سے حسین ساگر اور سکندرآباد کے درمیانی میدان میں "کارنیوال" آئی ہوئی ہے۔ جہاں اس میں تفریح کے لئے متعدد دلچسپیاں ہیں وہاں بے فکروں اور مالداروں کے واسطے دولت کمانے اور دولت گنوانے کے ذرائع بھی فراہم کر دیے گئے ہیں۔ ہمارے سادہ دل بھولے بھالے شہری جیتنے کی توقع پر ——— یا اس امید پر کہ ہارا ہوا پھر نکال لیں گے ——— لالچ لالچ میں سینکڑوں روپیہ ہار جاتے ہیں۔ اس جگہ ہمیں ایسے لوگ بھی قسمت آزمائی کرتے دکھائی دیے۔ جنکا تعلق محدود فرموں سے ہے یہ وہ لوگ ہیں جو کل دوسروں کو نصیحت کرکے اُن کو طرح طرح سے گرما کے اپنی محدود کمپنی کے شیر فروخت کیا کرتے تھے ——— مگر آج وہ خود دولت لٹانے کیلئے ایسے مقامات پر بلا کھٹکے چلے آتے ہیں جہاں محتسبوں اور حاسدوں کی کمی نہیں ہے۔

بقیہ صفحہ ۹

یہ سوال عبث ہے کہ اب بھی وہ سابق کی طرح غیر محفوظ ہوگا! بہرحال اس وقت جو چیزیں ہمارے پیش نظر ہیں اور جن کا تعلق مفادِ عامہ سے ہے۔ اور جنکی نسبت ہم نے جناب نواب مہدی نواز جنگ بہادر ناظم بلدیہ کی خدمت میں علحدہ نوٹ روانہ کردیا ہے وہ امور حسب ذیل ہیں:۔

الف ۔ سینما ہال کے اندرونی حصہ میں دو رویہ متعدد ستون نصب ہیں جو ادنیٰ کلاس سے لیکر اعلیٰ کلاس تک مسلسل چلے گئے ہیں۔ ان کے ار دگرد تماشائیوں کی نشستیں قائم ہیں۔ وہاں سے نظر کٹ جاتی ہے اور فلم دیکھنے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اگر کوئی فلم دیکھنے کی خاطر بہ مجبوری کوشش کرے کہ فلم ستونوں کے حائل ہونے کے باوجود بھی نہ کٹے تو اُسے دو ڈھائی گھنٹے تک مسلسل ستونوں کی آڑ سے فلم بچانے کیلئے اپنے سر کو اِدھر اُدھر حرکت دینا ہوگا۔ مگر اس کے باوجود بھی معترضہ مقامات سے فلم صاف دکھائی نہیں دیتی۔ یہ اس سینما کا سب سے بڑا اور انتہائی تکلیف دہ نقص ہے۔ جس سے تماشائیوں کو نہ صرف زحمت بلکہ سخت پریشانی ہوتی ہے۔ لہذا یا تو ایسے تمام حائل شدہ ستون نکلوا دیے جائیں یا اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو ایسی جملہ نشستوں کو بند کرادیا جائے جہاں سے نظر کٹ جاتی ہے۔

ب ۔ یہ کہ سینما ہال میں پنکھوں کی قلت ہے۔ جو پنکھے ہال میں نصب ہیں وہ دیوار سے متصل دو رویہ لگائے گئے ہیں۔ افسوس کہ ہال کے وسطی حصہ میں ہوا پوری طرح منتشر نہیں ہوتی۔ جسکے باعث ہال کا درمیانی حصہ سگرٹ کے دھوئیں سے غبار آلود اور تعفن سے کثیف رہتا ہے۔ جب ہال آدمیوں سے بھر جاتا ہے تو اسوقت کی بدکیفی ناقابل بیان ہوتی ہے، ایک تو دم گھٹتا ہے، دوسرے سگرٹ کے دھوئیں سے آنکھوں میں سوزش شروع ہوجاتی ہے اس سے صحت عامہ پر جو بُرا اثر پڑ رہا ہے وہ محتاج توجہ ہے۔ اگر چھ سات زائد برقی پنکھے نصب کرادیے جائیں تو یہ امر رفع شکایت کا موجب ہوگا۔

ج۔ یہ کہ دن کے تماشہ میں فلم صاف دکھائی نہیں دیتی۔ وجہ یہ ہے کہ چھت کے ٹین ایک دوسرے سے پیوست نہیں ہیں اور روشنی اندر آجاتی ہے۔ ٹین کے اندرونی حصہ میں آگ سے نہ جلنے والے مقوں کی سیلنگ ہونی چاہیئے تاکہ روشنی ہال کے اندرونی حصہ میں نفوذ نہ کرسکے۔

کیا انہیں معلوم نہیں کہ دیوار کے بھی آنکھیں ہوتی ہیں!

ہوشیار! اے مردِ عاقل ہوشیار!!

سر عبدالقادر | نامور ادیب سر شیخ عبدالقادر ادب اردو کی سرپرستی کے باعث بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، آپ اردو کے ان قابل احترام محسنین سے ہیں جنکے کارنامے آب زر سے لکھے جائیں گے۔ آپ برسوں پنجاب میں عہدہائے جلیلہ پر ممتاز رہے۔ اسکے بعد وزیر ہند کی کونسل کے ممبر منتخب ہو کر ولایت تشریف لے گئے۔ اس خدمت کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ فضیلت مآب وائسرائے بہادر بھی وزیر ہند کے راست ماتحت ہیں۔ شیخ صاحب بالقابہ ابھی ابھی وہاں سے وظیفہ حسن خدمت لیکر ہندوستان لوٹے تھے کہ سر ظفراللہ خاں کی جگہ وائسرائے کونسل کی ممبری پر آپ کا تقرر ہوگیا۔ اب آپ کے ماتحت کل ہند کی ریلوے اور تجارت کے سارے محکمہ جات ہیں۔

کلکتہ سے لندن تک | بھولی ہاؤس، جو ہمارے ملک کا ایک مشہور علمی ادارہ ہے۔ اس نے ایک نہایت دیدہ زیب، اور ہمیشہ کام دینے والا ہفت رنگی نقشہ تیار کیا ہے۔ جسمیں کلکتہ سے لندن تک تمام مشہور اور اہم مقامات ظاہر کئے گئے ہیں۔ جو حضرات ریڈیو سننے کے شائق ہیں یا جنہیں اخباری دنیا سے دلچسپی ہے اور مقامات جاننے کی فکر میں رہتے ہیں ان کے لئے یہ تحفہ بے بہا ہے۔ نیز سیاحوں اور زائروں کے لئے بھی یہ بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔

ہمارے ہمدرد معین | جناب محمد سلطان صاحب جناب محمود سلطان صاحب اور جناب حمید سلطان صاحب کے اسمائے گرامی اہل حیدرآباد کے لئے کچھ نئے نہیں ہیں۔ آپ پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے حیدرآباد میں پہلی دفعہ سگرٹ کے کارخانے نہایت اعلی پیمانہ پر قایم کئے۔

ہمیں اس امر کے اظہار میں مسرت محسوس ہوتی ہے کہ آپنے از راہ معاونت اپنی مختلف فرموں کے اشتہارات رسالہ فلم کو عنایت فرمائے جنکی مقدار سالانہ سات سو روپیہ ہے۔

دفتر فلم کی منتقلی | رسالہ فلم کا دفتر اعظم جاہی روڈ کاچی گوڑہ سے جیپل بازار کاچی گوڑہ میں منتقل ہوا۔

رسالہ فلم کی تاریخ اشاعت | رسالہ فلم ہر انگریزی مہینہ کی آخری تاریخ شائع ہوا کریگا۔

ناطق فلم

(ازجناب سید بشیر الدین احمد صاحب)

ناطق فلم دورِ جدید کی ایک ایسی ایجاد ہے جس سے ہر کہ و مہ محظوظ ہوتا ہے۔ اس ایجاد کو سمجھنا یعنی ان تمام برقی آلوں اور مشینوں کے عمل سے واقفیت حاصل کرنا، جن کی بدولت اسٹوڈیو میں فلم لیجاتی ہے اور پھر سینما گھر میں پیش کی جاتی ہے، اگرچہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں، تاہم جن اصولوں پر یہ دونوں عمل مبنی ہیں، وہ عام طور پر شاید بالکل ناقابل فہم اور غیر دلچسپ ثابت نہ ہوں گے۔ پردۂ سیمیں پر آرٹ کے ایک جیتے جاگتے شاہکار کے مشاہدے سے دل اور دماغ دونوں مسحور ہوتے ہیں۔ دل زیادہ اور دماغ کم۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ آلوں اور مشینوں کے اجزاء اور پرزوں کی حرکت اور عمل کے مطالعہ سے جن کی بدولت یہ شاہکار چلنے پھرنے اور بولنے کی قابلیت حاصل کرتا ہے، کم از کم دماغ ہی لطف اندوز نہ ہو سکے۔

ناطق فلم کے ایک ٹکڑے کو لیا جائے تو اُس پر تصاویر کا ایک تواتر اور کنارے پر لکیروں کی ایک لیک نظر آتی ہے، جیسا کہ شکل (۱) سے ظاہر ہے۔ یہ لیک آواز سے تعلق رکھتی ہے۔ اور تصاویر مناظر اور اداکاری سے۔ اب اول ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مناظر اور اداکاروں کی حرکات و سکنات کس طرح فلم بند کیجاتی ہیں۔ اس مقصد کیلئے خاص قسم کے عکاسی کے کیمرے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جو مختلف پرزوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کیمروں کی ساخت خصوصاً ناطق فلموں کے سلسلے میں بہت پیچیدہ ہوتی ہے، لیکن ان کے میکانی جزئیات سے ہمیں یہاں کوئی بحث نہیں۔ عام حیثیت سے ہر کیمرہ پر ایک زبردست عدسہ Lens موجود ہوتا ہے۔ جس کے پیچھے عکاسی کی کم عرض اور طویل منفی Negative Film فلم ایک مشین کی مدد سے مستقل رفتار سے گزاری جاتی ہے۔ فلم اور عدسہ کے درمیان ایک جھلملی عمل کرتی ہے جو فلم پر عدسہ کی

صوتی لیک
جو متغیر کثافت کی لکیروں پر مشتمل ہے

شکل (۱)
ناطق فلم کا ایک ٹکڑا

روشنی کو کھولتی اور بند کرتی ہے۔ یہ عمل مشین کی بدولت مستقل طور پر ایک خاص رفتار سے انجام دیا جاتا ہے
بظاہر تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلم کیمرے کے اندر مسلسل طور پر چل رہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ
چھوٹے چھوٹے جھٹکوں سے حرکت کرتی جاتی ہے۔ جونہی جھلملی کھلتی ہے، فلم ایک چھوٹے سے وقفہ (ثانیہ
کے ایک چھوٹے سے جزو) کیلئے ساکن ہو جاتی ہے، اور اس دوران میں فلم پر منظر کی تصویر اتر جاتی ہے۔
اس کے فوراً ہی بعد فلم اور عدسہ کے درمیان جھلملی حائل ہو جاتی ہے اور اسکے دوبارہ کھلنے تک فلم تصویر لئے
بغیر ہی گزر جاتی ہے۔ اس طرح فلم پر فی دقیقہ (منٹ) کوئی نوے (۹۰) تصاویر یکے بعد دیگرے اتار لیجاتی ہیں،
اور بعد میں اس منفی فلم سے جتنی مثبت فلمیں درکار ہوں، خاص طریقوں سے طبع کر لی جاتی ہیں، سینما گھر میں
جب مثبت فلم تظلیلی لالٹین Projecting Lantern میں جھٹکوں سے گزاری جاتی ہے! اور لالٹین
کے فلم اور عدسہ کے درمیان جھلملی سے اسی طرح عمل کیا جاتا ہے، جس طرح کہ اسٹوڈیو کے عکاسی کے کیمرے
میں کیا گیا تھا تو پردے پر تصاویر یکے بعد دیگرے اس تیزی سے آتی جاتی ہیں کہ ہماری آنکھیں اُن
ساکن تصاویر کے تواتر کو محسوس نہیں کر سکتیں، اور مناظر کی ہمیں ایک ایسی تصویر نظر آتی ہے۔ جس میں
مسلسل حرکت پائی جاتی ہے۔

فلم بندی کا جو طریقہ اوپر بیان کیا گیا ہے، وہ خاموش فلموں کے سلسلے میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔
جو فی زمانہ مفقود ہیں۔ ناطق فلم جو دراصل تصویر اور آواز کی ایک ہم آہنگ ترکیب ہے، اپنے تصویری
حصہ کی فلم بندی کیلئے اسی طریقہ کی محتاج ہے۔ اس فلم میں صدا بندی مختلف طریقوں سے کیجاتی ہے، اور
تمام طریقوں میں ایک مشترکہ امر یہ ہے کہ اخیر میں تصویری اور صوتی حصہ کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا
جاتا ہے۔ تاکہ سینما گھر میں فلم کے پیش کئے جانے پر آواز اور آواز کے متعلق اداکار کی حرکت ......
ایک دوسرے سے آگے یا پیچھے نہ ہونے پائے۔ اس نہج پر ناطق فلم کی تیاری کی پہلی کوشش ۱۸۷۸ء میں
ایک سائنس داں تھورپ Thorpe نے کی۔ اس نے فی ثانیہ چار کے تواتر سے عکسی تصاویر
لیں اور صدا بندی کے لئے فونوگراف کا استعمال کیا؛ عکسی تصاویر کو کاغذ کے ایک طویل پٹے پر چسپاں کرکے
پٹے کو چلایا جاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی فونوگراف بجایا جاتا تھا۔ دو سال بعد ہی فرٹس Fritts
نے صدابندی کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا۔ جس کی بدولت عکاسی کی ایک Photographic
Band پٹی پر آواز نقش کر لی جاتی تھی۔ آگے چل کر اڈیسن Edison نے تظلیلی لالٹین اور
فونوگراف کی مدد سے جو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرکے چلائے جاتے تھے، تھوڑی بہت کامیابی
کے ساتھ ایک ناطق فلم پیش کی۔ لیکن ان سب سے اہم طریقہ ۱۹۰۴ء میں" لاسٹ Lauste نے

دریافت کرلیا تھا۔ جس کی بنا پر صدا بندی کے ایک جدید طریقہ کی داغ بیل پڑی جو متغیر رقبہ Variab-le Area Method کا طریق کہلاتا ہے۔

متغیر رقبہ کے طریق کا اصول یہ ہے کہ اسٹوڈیو میں اداکاروں کی آواز کے زیروبم کو اول ایک مائکروفون کی مدد سے برقی تہیجاب Electrical Impulses میں تبدیل کرلیا جاتا ہے۔ شکل (۲) میں مائکروفون کا ایک دور Circuit دکھایا گیا ہے جس کے ہارن Horn کے اندر ابرق یا کسی موزوں دھات کا دیا فراغمہ Diaphragm یا جھلی نظر آتی ہے، اور جھلی کے پیچھے کاربن کے دانے پیک کئے گئے ہیں۔ برقی مورچوں Electric Batteries کی بدولت معمولی حالتوں میں ایک مستقل رو Constant Current اس دور میں موجود رہتی ہے! لیکن جب اداکاروں کی آواز کے زیروبم سے مائیکروفون کی جھلی دبتی اور چھوٹتی ہے تو جھلی کے دبنے سے کاربن کے دلنے ایک دوسرے پر دبتے ہیں۔ جس کی وجہ سے دور کا تعرض Resistance گھٹ جاتا ہے۔ لہذا رو بڑھ جاتی ہے، اور جھلی کے چھوٹنے پر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس طرح آواز کے اتار چڑھاؤ کے مطابق دور میں رو بڑھتی اور گھٹتی ہے —— آواز کا چڑھاؤ جتنا زیادہ ہو، اسی قدر رو بڑھ جاتی ہے۔ اور اُتار جسقدر زیادہ ہو، اسی طرح کم ہو جاتی ہے رو کے یہ تہیجات جو آواز کے زیروبم کا استفسار کرتے ہیں مائیکروفون کے دور سے کبرول Amplifiers کو منتقل کئے جاتے ہیں۔ جہاں ان کی تکبیر کیجاتی ہے۔ ان تکبیر یافتہ تہیجات کی مدد سے ایک چھوٹے سے آئینہ کو مرتعش کیا جاتا ہے جو دو مقناطیسی قطبوں کے درمیان سلیکان برائنز Silicon Bronze کی ایک تار سے

شکل (۲)
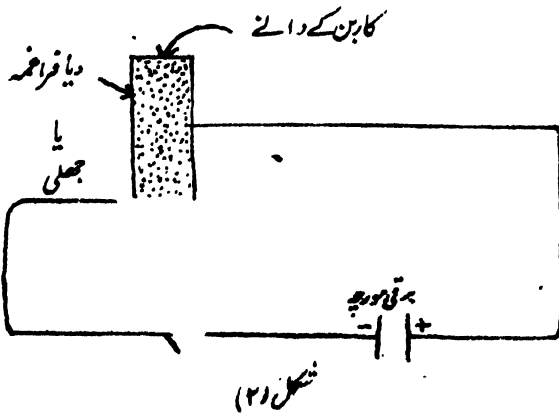
لگا ہوتا ہے۔ اس ارتعاش کن آئینہ سے روشنی کی شعاعیں ایک تنگ شگاف کے ذریعہ سے فلم کی صوتی لیک Sound Track پر منعکس کی جاتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لیک پر متغیر رقبوں کے ارتسامات نقش ہو جاتے ہیں جو شکل (۳) میں دکھائے گئے ہیں۔ چونکہ ان نقوش کا رقبہ آئینہ کے ارتعاشات کے مطابق بڑھتا گھٹتا ہے اور آئینہ کے ارتعاشات مائکروفون کے دور کی رو کے اتار چڑھاؤ پر منحصر ہوتے ہیں اور رو کا یہ تغیر آواز کے زیروبم پر مبنی ہوتا ہے، لہذا یہ

نقوش آواز کا استفسار کرتے ہیں اور فلم پر بمنزلہ آواز کی تصویر کے ہیں۔ آر۔سی۔اے۔فوٹوفون R.C. A. Photophone کا صدانگار آلہ اسی اصول پر صدابندی کی تکمیل کرتا ہے۔ اس طریقہ سے جو صوتی لیک حاصل ہوتی ہے، اس میں پس منظر Background Noise کی غیر ضروری آوازیں بھی مضمر ہوتی ہیں۔ جن سے رہائی حاصل کرنے کے لئے لیک کے صاف حصوں کو ایک خاص طریقے سے یا تو اُڑا دیا جاتا ہے یا سیاہ کر دیا جاتا ہے۔

شکل (۳)

شکل (۴)
صوتی لیک جس پر متغیر رقبہ کے نقوش دکھائے گئے ہیں۔

صدابندی کا ایک اور مشہور طریقہ متغیر کثافت Variable Density Method کا طریق کہلاتا ہے۔ جسمیں فلم کی صوتی لیک پر آواز کے زیروبم پر مبنی متغیر کثافت کی باریک لکیریں پیدا کی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں مائیکروفون کے برقی تہیجات کو کبروں کی مدد سے تکبیر دینے کے بعد روشنی کی ایک جھلملی Light Gate پر منطبق کیا جاتا ہے۔ جو تہیجات کی قوت کے مطابق کھلتی بند ہوتی ہے۔ چنانچہ روشنی کے شگاف سے شعاعوں کا ایک متغیر مجموعہ نکلتا ہے۔ جس کے تغیرات برقی تہیجات کے موافق ہوتے ہیں۔ روشنی کے اس مجموعہ کو فلم کی صوتی لیک پر ڈالا جاتا ہے، اور جب فلم دُھل کر تیار ہوتی ہے تو لیک پر متغیر کثافت کی باریک لکیریں ظاہر ہوتی ہیں۔ جن کی کثافت آواز کے اتار چڑھاؤ پر مبنی ہوتی ہے۔
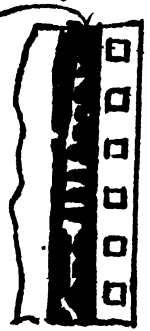
ویسٹرن الیکٹرک Western Electric کا صدانگار آلہ اسی طریقہ پر متغیر کثافت کی لکیریں پیدا کرتا ہے۔ جو شکل (۱) میں دکھائی گئی ہیں۔ اس قسم کی صوتی لیک تاباں لیمپ Glow Lamp کے استعمال سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جو "فاکس فلم کارپوریشن" Fox Films Corporation کا طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں مائیکروفون کے تہیجات کو تکبیر دینے کے بعد ایک تاباں لیمپ پر منطبق کیا جاتا ہے

جس کی روشنی برقی تہیجات کے ساتھ بڑھتی گھٹتی ہے ۔ اس متغیر روشنی کو مندرجہ بالا طریقہ سے صوتی لیک پر ڈالا جاتا ہے ۔

ناطق فلموں میں صدابندی کیلئے گراموفون کے ریکارڈ بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں ۔ یہ ریکارڈ موم سے بنائے جاتے ہیں ۔ اور ان کا قطر عموماً ١٧ انچ اور موٹائی ایک انچ ہوتی ہے ۔ ریکارڈوں پر آواز کی لکیریں برقی میکانی Electro-Mechanical طریقہ سے (جو گراموفون ریکارڈنگ میں استعمال ہوتا ہے) مرکز سے باہر کی جانب کاٹی جاتی ہیں اور یہ ریکارڈ کی رفتار فی دقیقہ ٣٣ ۱/۳ چکر ہوتی ہے ۔

صدابندی کے تمام طریقوں میں اس امر کی احتیاط کی جاتی ہے کہ تصویر اور آواز میں کامل ہم آہنگی رہے ۔ اس لئے فلم اور صوتی لیک کو چلانے والی برقی موٹروں کو خاص طریقوں سے بالکل ہم قدم اور ہم آہنگ رکھا جاتا ہے ۔ جس کی وجہ سے اُن کی رفتار ہمیشہ یکساں رہتی ہے ۔ مناظر کی عکاسی اور صدابندی شروع کرنے سے قبل فلم اور لیک دونوں پر نشان لگا دیے جاتے ہیں ، تاکہ بعد میں دونوں کو جوڑنے میں آسانی ہو اور دونوں میں کامل مطابقت پائی جائے ۔

یہاں تک فلم کی عکاسی اور صدانگاری کے بعض اہم طریقوں کے متعلق بحث ہوئی ۔ جب تصویر اور آواز کی منفی نقلیں تیار ہو جاتی ہیں اور دونوں کو جوڑ کر ایک دوسرے کے مطابق کر دیا جاتا ہے تو اس سے جتنی مثبت نقلیں ضروری ہیں طبع کر لی جاتی ہیں اور انہیں سینما گھروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ سینما گھر میں کس طرح اس فلم سے متحرک اور ناطق تصاویر پیش کی جاتی ہیں ۔ یہاں یہ فلم جیسا کہ آگے بھی ذکر ہو چکا ہے ۔ تظلیلی لالٹین کے عدسا اور چراغ کے درمیان جھٹکوں سے گزاری جاتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی عدسہ اور فلم کے درمیان مغلق عمل کرتی ہے ۔ جو عدسہ پر فلم کی روشنی کو بند کرتی کھولتی ہے ۔ لالٹین میں یہ تمام عمل اسی طرح انجام دیے جاتے ہیں ، جس طرح عکاسی کے کیمرے میں فلم لیتے وقت ان کی تکمیل کی گئی تھی ، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سینما گھر کے پردے پر یکے بعد دیگرے تصاویر اس تیزی سے آتی جاتی ہیں کہ ہمیں تسلسل کا دھوکا ہوتا ہے اور مناظر اور اداکار حرکت کرتے اور بولتے نظر آتے ہیں ۔

اس کے ساتھ ساتھ صوتی لیک پر شعاعوں کا ایک مجموعہ ڈالا جاتا ہے اور لیک کی متغیر کثافت کی لکیروں یا متغیر رقبوں کے نقوش کی وجہ سے لیک سے متغیر روشنی نکلتی ہے ۔ جو ایک برقی ضیائی خانہ Photo-Electric-Cello پر مرتکز کی جاتی ہے ۔ یہ خانہ ایک خلا دار جوفہ Vacuum Bulb ایک تیز حس تختی Sensitive Plate اور ایک دھاتی جالی Metallic Grid پر مشتمل ہے ۔ تیز حس تختی چاندی سے بنائی جاتی ہے۔ جس کے ایک رُخ پر جہاں روشنی ڈالی جاتی ہے۔ پوٹاسیم Potassium کی ایک تہ چڑھادی جاتی ہے اس تختی کو برقی مورچہ کے منفی سے اور دھاتی جالی کو مثبت سے لگا یا دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے تختی برقیوں Electrons کی توفیر ہو جاتی ہے اور وہ منفی طور پر Negatively Charged ہو جاتی ہیں۔ اور جالی پر برقیوں کی کسر ہو جاتی ہے اور وہ مثبت طور پر بار ہو جاتی ہے ۔ روشنی کی غیر موجودگی میں تختی اور جالی کے دور میں رَو معدوم ہوتی ہے، کیونکہ دونوں کے درمیان خلا بطور ایک حاجز Insulator کے عمل کرتی ہے ۔ لیکن

شکل (۵)
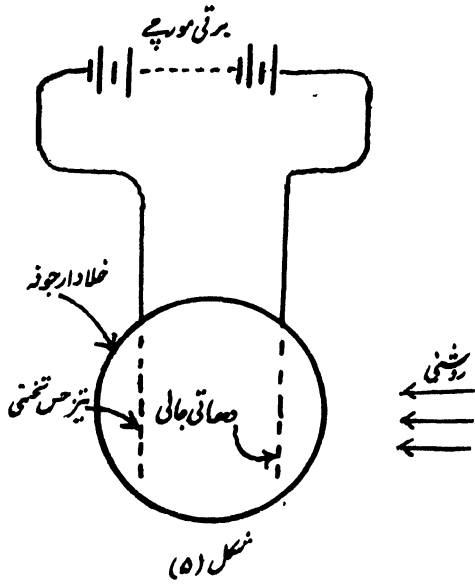
جب تختی کے تیز حس رُخ پر روشنی کی شعاعوں کا مجموعہ ڈالا جاتا ہے تو تختی کے برقیوں میں ایک ہیجان رونما ہوتا ہے اور برقیوں کا اندفاع Repuleion شروع ہوتا ہے، اور اسی وقت جالی پر جہاں برقیوں کا خسارہ رہتا ہے، تختی کے برقیوں کا انجذاب Attraction شروع ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تختی سے جالی کی برقیوں کی ایک بوچھاڑ شروع ہوتی ہے، یا بالفاظ دیگر ضیائی برقی خانہ کے دَور میں تختی سے جالی کی طرف، دونوں کے درمیان خلا کے ذریعہ ایک برقی رَو بہتی ہے ۔ اس رَو کی قوت روشنی کی تیزی پر منحصر بلکہ تقریباً متناسب ہوتی ہے، روشنی جس طرح تیز ہوتی جاتی ہے، اسی طرح برقیوں کی بوچھاڑ اور لہٰذا رَو بھی قوی ہوتی جاتی ہے اور جس طرح کم ہوتی ہے، معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے ۔ غرض صوتی لیک سے متغیر روشنی کی جو شعاعیں ضیائی برقی خانہ پر ڈالی جاتی ہیں، ان کی بدولت خانہ کے دور میں متغیر رَو کا ظہور ہوتا ہے ۔ جس کا تغیر روشنی کے تغیر کے مطابق ہوتا ہے ۔ رو کے ان تغیرات کو مکبر کی مدد سے تکبیر دی جاتی ہے اور پھر تاروں کے ذریعہ سینما کے پردے کے

پیچھے آوازرساں Loud Speaker کو روانہ کیا جاتا ہے۔ جو انہیں دوبارہ آواز میں تبدیل کرتا ہے۔
آوازرساں کے عمل کا اصول یہ ہے کہ رَو کے تکبیر یا مدّ تغیرات سے ایک برقی مقناطیس Elec tro magnet پر عمل کیا جاتا ہے جس کے مقناطیسی میدان Magnetic Field میں لوہے کا ایک مقنا روک رو Armature کے تغیرات کے مطابق حرکت کرتا ہے۔ یہ حرکت ایک مخروط کے ذریعہ ہوا کو پہنچائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے آواز پیدا ہوتی ہے۔
اس سے قبل ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ صوتی لیک کے متغیر کثافت کی لکیریں یا متغیر رقبے کے نقوش کس طرح آواز کے زیر و بم کا استحفار کرتے ہیں۔ اب ان نقوش یا لکیروں کو آواز میں تبدیل کرنے کے طریقے پر دوبارہ ایک نظر ڈالی جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان نقوش پر روشنی کی شعاعوں کے انعکاس سے

شکل (۲)
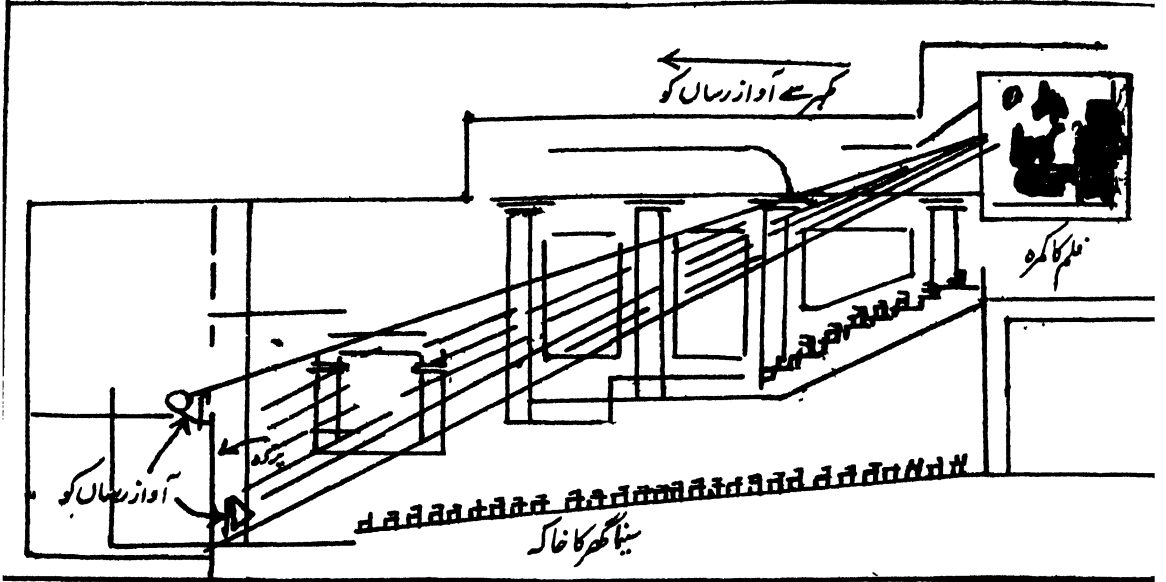
متغیر روشنی حاصل کیجاتی ہے جسکا تغیر لکیروں کی کثافت یا نقوش کے رقبوں کے مطابق ہوتا ہے، پھر اس روشنی سے ضیائی برقی خانے میں متغیر رَو پیدا کیجاتی ہے جسکا تغیر روشنی کے مطابق ہوتا ہے۔ اور یہاں سے اس متغیر رَو کی بدولت آوازرساں کے مقنا روک کو حرکت دیجاتی ہے۔ جو رَو کے تغیر کے مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ اس حرکت سے جو آواز پیدا ہوتی ہے، وہ اصلی آواز کا ٹھیک استحفار کرتی ہے اور چونکہ آوازرساں سینما کے پردے کے پیچھے لگایا جاتا ہے۔ اسلئے ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متحرک تصاویر بالکل زندہ انسانوں کی طرح بولتی اور گاتی ہیں۔ (شاہکار)

انجمن اصلاح سینما

جناب مولوی غلام مصطفٰے صاحب۔ صدر انجمن ترک سینما کے خطبہ کا اقتباس

ہندوستان میں جب تک بیرونی فلموں کی درآمد رہی سینما کو یہ قبول عام نصیب نہ تھا جو آج اُسے حاصل ہے اب سے آٹھ دس سال پہلے ہندوستان کے بڑے سے بڑے شہر میں بھی چار یا پانچ سے زائد سینما ہال نہ تھے مگر آج اس صنعت نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں وہ ترقی اور وسعت پیدا کر لی ہے کہ دن عید اور رات شب برات ہو گئی ہے۔ شہر سے قطع نظر اب گاؤں گاؤں قریہ قریہ میں بھی سینما ہال بن گئے ہیں۔ ایک عالم ہے جو اسیر والہ و شیدا ہے بچے جوان کیا بلکہ بوڑھے بھی سینما کے جراثیم سے مبتلا نظر آتے ہیں۔ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ہندوستان مفلس ملک ہے مگر سینما نے اسے اور دیوالیہ کر دیا ہے اس میں شک نہیں کہ چند لوگ اسکی بدولت آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے ہیں مگر چند کے آرام و آسائش کو لاکھوں اور کروڑوں کی مصیبت پر ترجیح نہیں دیجا سکتی۔ جو لوگ اسکی وجہ سے عیش و راحت میں ہیں ان کا میلان طبع طرز زندگی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اگر کوئی ان مقامات کو دیکھے جہاں فلم بنتے ہیں تو وہ یقیناً خون کے آنسو روئیگا۔ اس لئے کہ فلم کمپنیوں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہے اخبارات وغیرہ سے بھی اس زبون حالت پر روشنی پڑتی رہتی ہے اس میں شک نہیں کہ فلم ہم ہندوستانی بناتے ہیں مگر اس کی تیاری پر جو ادویات خرچ ہوتی ہیں اور اسمیں جو سلولیٹ صرف ہوتی ہے اور یہ جن آلات کے ذریعہ بنائی جاتی ہیں وہ سب غیر ممالک کی ایجاد ہے ان معمولی لوہے کے ٹکڑوں اور سلولیٹ کی ریلوں پر ہمارا کروڑوں روپیہ صرف ہو رہا ہے ہم سونا دیکر کیا لے رہے ہیں چند لوہے کے ٹکڑے چند ادویہ اور چند سلولیٹ کے پتر۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ ہم جواہرات دے کر اسکے معاوضہ میں خزف ریزے حاصل کر رہے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ جسکے لئے ہم اپنا متاع برباد کر رہے ہیں اس سے ہمیں کیا نفع ہوگا۔ اور اس لوہے کے ٹکڑوں کی بدولت ہم اقوام عالم میں ایسی کونسی برتری حاصل کریں گے۔ اہل ہند کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ سوائے فوٹو اتارنے کے کوئی ہنر نہیں جانتے یعنے ہم نے سوائے تقلید کے اپنی طرف سے کوئی جدت پیدا نہیں کی۔ ہم اسی نقطہ پر اب بھی گردش کر رہے ہیں اب سے چند سال پہلے ہمارا جو محور تھا۔ ہم خود سمجھ سکتے ہیں کہ ہم دنیا میں کتنے بلند تھے کتنے نیچے ہو گئے۔ ہمارے اسلاف کے

کیا او صاف تھے اور ہم کیا ہیں ایک طبقہ ایسا بھی نظر آتا ہے جو سینما مفید بتاتا ہے اور وہ لوگ جو سینما سے بیزار ہیں انکو خبطی تصور کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ سوشیل فلموں کی بدولت ہندوستان نے اپنے معاشرے کی بہت کچھ اصلاح کر لی۔ مگر انہیں یہ معلوم رہے کہ جن پاک بازوں کے دماغ جن میں عورت اور مرد دونوں شامل ہیں ــــــ اس سے بالکل خالی ہیں تو کیا وہ ایسے فلمیں دیکھنے سے متاثر نہونگے؟ وہ شریف بیبیاں جو اپنے گھر کی چار دیواری سے آگے کچھ نہیں جانتی جب وہ فلموں میں دیکھینگی کہ ایک عورت کو ایک مرد نے بہکایا اور وہ اسکے ساتھ ہوگئی۔ مرد نے ساتھ نہ دیا عورت اپنی اس حرکت پر پشیمان ہونے لگی اور دوسری عورتوں کو کہنے لگی کہ تم ایسا ہرگز نہ کرو کہ ان حرکات کا پھل ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔

اب آپ غور فرمایئے کہ عورتیں اس سے واقف ہوگئیں کہ ایک عورت دوسرے مرد کے ساتھ بھاگ سکتی ہے گو اس کا انجام برا بھی ہے مگر اس سے یہ ہوا کہ وہ لڑکیاں یا وہ لڑکے جن کے دماغ اس خیال سے ناآشنا اور نامانوس تھے ان کو بھی یہ طریقہ باسانی معلوم ہوگیا۔ سینما بینی سے جس طرح عورتوں کے ناز و ادا دیکھنے سے مردوں کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے کیا اس طرح عورتوں کے جذبات بھی برانگیختہ نہیں ہوسکتے؟ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاہدان بازاری کیا مصلح قوم بن سکتی ہیں؟ کیا فلم کی بدولت ڈاکہ زنی عیاشی شراب خواری کا انسداد کیا جا سکتا ہے ہم فلموں میں یہی دیکھتے آرہے ہیں کہ عورتیں رقص کرتی ہیں گاتی ہیں بجاتی ہیں مردوں سے بیباکانہ گفتگو کرکے حیادار عورتوں کو شوخ اور بے حیا بناتی ہیں ہمارا تو یہ خیال ہے کہ خواہ کسی نوعیت کی فلم ہو اس سے مرد عورت بچے بوڑھے جوان سب کے خیالات متاثر اور جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ ان سب چیزوں کے قطع نظر سینما بینی سے مالی نقصان ہوتا ہے اس طرح کہ غریب آدمی خود سینما دیکھے تو اُسے چھ آنے خرچ کرنے پڑتے ہیں اگر اسکے بال بچے آجائیں تو یہ خرچہ روپیوں تک پہونچ جاتا ہے اور آجکل کے زمانہ میں فلم فرقہ وارانہ جذبات کے بھی محرک ہوجاتے ہیں اسطرح کہ اگر کوئی فلم کمپنی مذہبی کیارکٹر کو بگاڑ کے پیش کرے تو ایک فتنہ کھڑا ہوجاتا ہے اگر فلم میں ایسا کیارکٹر آجائے تو وہ بھی فساد کا باعث ہوجاتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ عوام الناس زیادہ تر سراغ رسانی لوٹ مار لڑائی جھگڑے اور عیش و نشاط کے فلموں کو پسند کرتی ہے جسکے نتائج حد درجہ مضر ہوتے ہیں سینما یوں بھی طبی نقطۂ نظر سے صحت پر برا اثر ڈالتی ہے یہ کہ زیادہ رات جاگنے سے آرام نہیں ملتا پردے پر نظر جمانے سے اور روشنی کے اتار چڑھاؤ سے اور تصاویر کی حرکت سے آنکھوں پر بھی بار پڑتا ہے ایک بند ہال میں کثیر مجمع بند رہنے کی وجہ سے ہوا متعفن ہوجاتی ہے اور سگریٹ کے دھوئیں کے باعث اندرونی فضا مکدر ہوکر دل و دماغ اور پھیپھڑوں پر برا اثر ڈالتی ہے۔ سینما میں مختلف طبائع کے لوگ جمع ہوتے ہیں جن سے شریف لڑکے

آوارہ ہو جاتے ہیں - اور اسی جگہ سے بداخلاقی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے - اور یہی ایک ایسا مکتب ہے جسکی تعلیم پا کر لڑکے اور جوان مختلف جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں - اور ملک کی بدنصیبی یہ ہے کہ فلموں کے ذریعہ نامانوس اور سخت الفاظ کو فلموں میں شامل کر کے زبان کا ستیاناس کیا جا رہا ہے جسکے باعث زبان سے بیگانگی بڑھتی جا رہی ہے مذہبی نقطہ نظر سے بھی سینما بینی ہندو مسلمانوں کے لئے درست نہیں اور اخلاقی حیثیت سے بھی سینما مفید نہیں ہے چونکہ مسلمان سینما بینی میں دیگر اقوام سے پیش پیش ہیں اور ان کی مالی حالت بھی حد درجہ سقیم ہے اور یہ اپنے معصوم بچوں اور شریف بیبیوں کا حق مار کر اس سے اپنی اولاد کو محروم کر رہے ہیں اگر وہی پیسہ یہ لوگ اپنے قیام و طعام اور لباس پر خرچ کریں اور کچھ پیسہ پس انداز کریں تو اس سے انکی معاشی حالت درست ہو جائیگی - ان تمام عیوب و نقائص کو یک لخت رفع کرنا اور سینما بینی کو بھی یکدم موقوف کرنا مشکل امر ہے کیونکہ ہمارے طبائع ترک سینما کے ابھی عادی نہیں ہیں اسلئے ہمارے اولین فرائض یہ رہیں گے کہ سینماؤں کی اصلاح کی جائے اور وہی فلم دیکھے جائیں جو مذہبی و اخلاقی نقطہ نظر سے درست ہوں اس طریقہ سے ہم سینما بینی بتدریج کم کریں گے -

ان اغراض کے لئے ایک ایسے انجمن کی تشکیل دیجائے جو ان فرائض کو بحسن و خوبی انجام دے سکے۔ اس انجمن کا نام انجمن اصلاح سینما رکھا جائے -

سینما کی تباہ کاریاں

جناب شیخ سعید الدین احمد صاحب مددگار محکمہ کوآپریشن (پنجاب)

میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ بوڑھا جلد ساز جس کی بینائی میں فرق آچکا تھا کتابوں کی مرمت میں مشغول تھا۔ رعشہ کی وجہ سے وہ سوئی میں بڑی مشکل سے دھاگہ ڈال سکتا تھا۔ رجسٹروں اور کتابوں میں چھید لگاتے وقت بڑی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ قینچی لے کر اس کا ہاتھ بڑی مشکل سے چلتا تھا، جزبندی میں اوراق منتشر ہو جاتے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھا اس کی حالت کا اندازہ کر رہا تھا۔ اور رحم کے جذبات دل کی گہرائیوں میں پیدا ہو کر تاثرات میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ دنیا میں کما کر پیٹ پالنا کتنا مشکل ہے۔ بڑھاپا اور اس میں مشقت، نقاہت اور اس میں محنت۔ یہ سب کیا ہے؟ دنیاوی عذاب وہ پیر مرد جو عصا کے بغیر دو قدم بھی نہ چل سکتا ہو اور اسے بنک کی بڑی بڑی کتابیں اٹھا کر شکنجہ میں رکھنی پڑتی ہوں تو اسے تکلیف کیونکر نہ ہو۔ وہ بوڑھا آدمی جسے طاقت جواب دے گئی ہو۔ آری سے موٹی موٹی کتابوں کو کس طرح ہموار کرے؟ بوڑھا انتہائی تکلیف کے ساتھ یہ سب کام کر رہا تھا اور میں اسے دیکھ رہا تھا۔

میں بوڑھے سے اظہار ہمدردی کے لئے بیتاب اور ایک روحانی کشمکش میں مبتلا تھا۔ انسان اور اس کی مجبوری کا خیال میرے لئے سوہان روح تھا۔ سوچتا تھا کہ زندگی اور اس کا فلسفہ کیا ہے۔ بنی نوع انسان پر آلام و مصائب کے اسی لا انتہائی سلسلہ کی کیا حقیقت ہے؟ کیا یہ وہی انسان ہیں جو باغ بہشت سے نکالا گیا تھا؟ کیا اسی انسان کو خدا کا خلیفہ کہا گیا ہے؟ میں غور و فکر میں منہمک تھا۔ اور انسانی زندگی کے زیادہ قریب ہو کر اس کے صحیح حالات کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ میں زندگی کے جام کو اس کی تمام شیرینیوں اور تلخیوں کے ساتھ نوش کرنا چاہتا تھا۔ سوچتا تھا کہ ہماری دنیائے حیات پر تکالیف اور مشکلات، غربت اور افلاس، آلام اور مصائب کے بادل کیوں چھائے ہوئے ہیں لیکن ان تمام باتوں کا صحیح حل میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔

بوڑھا اپنے کام میں معروف تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سوئی میں دھاگہ ڈالنے کے لئے وہ اپنے کرتہ کے دامن سے آنکھیں صاف کر رہا تھا۔ اس کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ میں کرسی سے اٹھا اور اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ بوڑھے نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اس کے منہ سے آہ نکلی۔ جو گفتگو ہمارے درمیان ہوئی

یہ تھی :-

میں ۔" بڑے میاں تمھارا کوئی لڑکا ہے ؟"

وہ " جی ہاں میرے دو لڑکے ہیں ۔"

میں ۔" ان کی عمر کیا ہے ؟"

وہ " جناب ایک اٹھارہ دوسرا پندرہ سال کا ہے ۔"

میں " تو پھر وہ پڑھتے ہوں گے ۔"

وہ " جی نہیں ۔ ایک نے نویں اور دوسرے نے چھٹی " جماعت تک پڑھ کر چھوڑ دیا ۔"

میں " وہ کیوں ؟"

وہ " صاحب کیا بتاؤں ، میری قسمت ۔ اچھے بھلے دونوں پڑھتے تھے ۔ میں خیال کرتا تھا ۔ تھوڑے دنوں تک میری سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھے گی ۔ بچے جوان ہو جائیں گے اور مجھے آرام حاصل ہوگا ۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا ۔ دونوں لڑکوں کو سینما دیکھنے کی ایسی چاٹ پڑی کہ مدرسہ چھوڑ دیا ۔ کتابیں بیچ کر ماں کا زیور چرا کر ، میری جیب سے پیسے نکال کر اور قرض اٹھا کر انھوں نے سینما دیکھنا شروع کر دیا ۔ بعض دفعہ مجھے فاقہ ہوتا ہے ۔ لیکن وہ دونوں سینما میں ہیں ۔ آخر اللہ کی مرضی ۔ خدا اس سینما کو غارت کرے ۔ اس نے مجھے تو تباہ کر دیا ۔ گھر میں ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصاویر آویزاں ہیں اور صبح شام انھیں کو دیکھتے رہتے ہیں ۔ رات دن وہی گانے گنگناتے ہیں جو وہاں سے سن آتے ہیں ۔ میں ایسی اولاد سے تنگ آگیا ہوں ۔ میں اپنا پیٹ بھی نہیں پال سکتا ۔ لیکن وہ سینما دیکھنے کے لئے پیسے ضرور طلب کرتے ہیں ۔ دوں تو کہاں سے ۔ غریب آدمی ہوں ۔ کل رات میں نے بڑے کو آٹا لانے کو روپیہ دیا ۔ وہ جب آٹا لایا تو اس کی ماں نے کہا کہ بیٹا آٹا تھوڑا معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن وہ گرا کر کہنے لگا کہ خود لے آئیں یا کسی اور سے منگوا لیا ہوتا ، کام بھی کرتا ہوں ، نام نہیں ہوتا ۔ تھوڑا ہے ، خراب ہے ۔ صاحب عورت ذات تھی چپ ہو گئی ۔ اس نے مجھے بتایا ۔ میں نے دوکاندار سے پوچھا ۔ اس نے کہا کہ وہ تو بارہ آنہ کا آٹا لے گیا ہے ۔ میں خاموش ہو گیا ۔ معلوم ہوا کہ وہ کل سینما میں ناچ دیکھنے گیا تھا ۔ آٹے میں سے جو چونی رکھ لی تھی اسی کا ٹکٹ لیا ہوگا ۔ چار آنے کا آٹا ہم دو وقت کھاتے ۔ لیکن اس نابکار کو کیا پروا ۔ خدا نے مجھے ایسی اولاد نہ دی ہو تو اچھا تھا ۔"

بوڑھا خاموش ہو گیا ۔ لیکن اس کے زرد چہرے سے اداسی اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے ۔ میرے جذبات میں ایک عجیب قسم کا تلاطم پیدا ہوا ۔ اور میں اپنی قلبی کیفیات سے متاثر ہو کر اپنی جگہ پر جا بیٹھا ۔ یہ ایک بالکل سچا واقعہ ہے ۔ لہٰذا میں اپنا فرض خیال کرتا ہوں کہ برادران ملک کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کر کے یہ بات ان کے گوش گذار کروں کہ سینما ہمارے بچوں کے اخلاق پر کس قدر برا اثر ڈال رہا ہے ۔ درحقیقت سینما انسانی طبیعت پر ایک عجیب اثر چھوڑتا ہے ۔ جس قسم کا ڈرامہ ہو اسی قسم کے خیالات دل میں جاگزیں ہو جاتے ہیں ۔ اس خیال کی تائید میں ایک واقعہ عرض کئے دیتا ہوں

جس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے ۔ حتی الامکان وہی خیالات ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو راوی نے بیان کئے ہیں ۔

میرے ایک دوست اپنی بیوی کو سینما دکھانے کے لئے لے گئے ۔ ان کی بیوی غیر تعلیم یافتہ لیکن سلجھی ہوئی عورت ہیں ۔ جب وہ اپنے بکس میں بیٹھے ڈرامہ دیکھ رہے تھے تو بیوی کے جذبات میں یک لخت ہیجان پیدا ہوا اور وہ ان سے لپٹ کر کہنے لگیں کہ میاں میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی تم سے اسی طرح محبت کروں جس طرح وہ عورت اپنے دوست سے کر رہی ہے ۔ معاف کیجئے ۔ مجبوری کی حالت میں ان الفاظ کا اعادہ کرنا پڑا ۔ اب آپ خیال فرمائیں کہ جب ایک نیک نہاد بیاہی ہوئی عورت کے دل میں اس قسم کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں تو جوان لڑکوں اور نوجوان لڑکیوں کے دلوں میں سینما دیکھ کر فاسد خیالات کیونکر پیدا نہ ہوں گے ۔ ہم اور ہمارے نوجوان بچے شادی اور غیر شادی شدہ مرد اور عورتیں جس وقت موجودہ ڈرامے دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں نہایت برے خیالات پیدا ہوتے ہیں ۔ جو ان کی معاشرتی اخلاقی اور روحانی حالتوں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوتے ہیں ۔

رہنمایان اور بردران ملک کو چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے نوجوان بچوں کو سینما نہ دیکھنے دیں اسکولوں اور کالجوں کے طلباء اب صرف ڈراموں پر تنقید کرنا ہی اپنی قابلیت خیال کرتے ہیں ۔ بڑے بڑے عمامہ بند شریعت اور جبہ پوش طریقت بڑے بڑے پنڈت اور گرنتھی سینما کے گانے گنگناتے سنائی دیتے ہیں ۔ بڑے بڑے کنجوس ساہوکار سینما دیکھنا ضروری خیال کرتے ہیں لیکن اگر کوئی بھوکا روٹی مانگے تو اسے ایک پیسہ تک دینا گوارا نہیں کرتے ۔ میرے پاس ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے میں ثابت کر سکتا ہوں کہ پانچ آنہ یومیہ مزدوری حاصل کرنے والے شام کو چار آنہ کا ٹکٹ لے کر سینما میں رونق افروز ہوتے ہیں ۔ اور گھر میں بوڑھی ماں یا جوان بیوی اندھیرے میں بیٹھی ان کی راہ تکتی ہے ۔ ہر آہٹ پر چونک اٹھتی ہے ۔ گھر میں چراغ کے لئے تیل لانے کو پیسہ پاس نہیں ۔ بعض حالات میں اہل خانہ کے ضروری اخراجات کے لئے پیسہ نہیں ہوتا ۔ لیکن گھر کا مالک سینما میں بیٹھا مس کجن کے گانے اور سلوچنا کے رقص دیکھنے میں مصروف ہوتا ہے ۔

اگر وہی چار آنہ جن کا ٹکٹ لیا گیا تھا بیوی بچوں پر صرف کئے جاتے تو بہت کچھ مصیبت دور ہو جاتی ۔ اگر وہی چار آنے کسی غریب کو خیرات کے طور پر دئے جاتے تو اس کے دل سے ہزاروں دعائیں نکلتیں اور اگر وہی چار آنے بچائے جاتے تو کسی ضرورت کے وقت کام آتے ۔ بیماری کی حالت میں دوا آتی ۔ تندرستی کی حالت میں کسی اور مفید مطلب پر صرف ہوتے ۔ سینما والوں کو کیا خبر کہ ملک میں ان کی جان کو کہاں کہاں رویا جا رہا ہے ۔ ایکٹروں ایکٹرسوں کو کیا علم کہ ان کے حسن و جمال کو کہاں کہاں بد دعائیں دی جا رہی ہیں ۔ قلم کی روانی اور تخیل کی جولانی نہیں بلکہ یہ مصیبت زدہ ہندوستان کی داستان غم ہے ۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ سچی کہانی ہے ۔ یہ وہ مناظر ہیں جن کے پس پردہ ہندوستان اور اس کی معاشرت کا بھیانک بلکہ خونخوار چہرہ ہے جو تمام ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے آمادہ نظر آتا ہے ۔ انہیں

صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی بد دعائیں دے رہا ہے جنھوں نے اُسے اس نوبت تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن عبارت ماتا کے بیشتر سپوتوں کا رجحان طبع پردۂ سیمین کی طرف دیکھا جاتا ہے اور وہ اداکاروں کے مصنوعی تزئین وجمال اور حسن وآرائش پر لٹو نظر آتے ہیں تو سارے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اور سینما کے خلاف انفرادی کوشش کامیاب بھی نہیں ہو سکتی۔ خدا کرے اس طلسم سامری کو توڑنے کے لئے کوئی موسیٰ پیدا ہو۔ درحقیقت ہماری کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ سینما کے شوقینوں کے دل میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہو۔

قوم اور ملک کا اعتماد معاشیاتی استحکام پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن جب ملک کی آمدنی کا ایک حصہ سینما کی نذر ہوتا ہو تو ملک کس طرح خوشحال ہو سکتا ہے۔ اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور شہر کی شاید پندرہ سینماؤں کی روزانہ آمدنی بیس اور تیس ہزار کے درمیان ہے۔ خیال فرمائیے کہ جس شہر کا اتنا روپیہ فضول ضائع جاتا ہو اس کی اقتصادی حالت کس طرح مستحکم ہو سکتی ہے۔ اس کا افلاس کس طرح دور ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک کے ڈراموں میں سے چند چھوڑ کر باقی سب پر کسی خوف وخطرہ کے بغیر یہ فتویٰ عائد ہو سکتا ہے کہ وہ اخلاقی معیار سے گرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ یا تو ایسے ڈراموں کے خلاف جہاد کریں اور جس طرح ہو سکے کوشش کریں کہ ہمارے نوجوان انہیں نہ دیکھیں بعض ممالک میں حکومت نے اس قسم کے احکام جاری کئے ہیں جن کے ماتحت بیس سال کی عمر کے بچوں کو سینما دیکھنا قانوناً منع ہے۔ لہٰذا ہم ارباب حل وعقد کی خدمت میں مؤدبانہ ملتمس ہوں کہ وہ اس بات کی پوری کوشش کریں کہ اس قسم کا مفید قانون ہمارے ملک میں بھی جاری کیا جائے تاکہ ہم اس پستی کی طرف نہ جا سکیں جو روز بروز ہمیں نکبت وادبار کی طرف لئے جا رہی ہے۔ مجالس وضع قوانین کے معزز ممبران اگر ذرا کوشش کریں تو اس قسم کا قانون پاس ہو سکتا ہے۔

ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے سوانح حیات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی یہ بات روز روشن کی طرح نظر آتی ہے کہ اس طبقہ میں غالب تعداد ان لوگوں کی ہے۔ جنھوں نے بیحیائی اور عصمت فروشی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ کئی ایکٹرسیں اس بات کا رونا روتی ہیں کہ کس طرح اس دنیاوی جہنم میں داخل ہو کر انھوں نے مجبوراً اپنی شرافت کو خیرباد کہہ دیا۔ اہل بصیرت ان واقعات کو مدنظر رکھ کر آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ سینما بقول حضرت علامہ اقبال فی الحقیقت دوزخ کی مٹی ہے۔ جس آدم زاد کی اس پر نظر پڑے گی اس کے دامنِ نگاہ کو غبار آلود کرتی ہوئی لوحِ دل کو جا کر مکدر کر دیگی۔ عصر حاضر کے بیمثل فلاسفر اور بیبدل شاعر علامہ ڈاکٹر اقبال سینما کے متعلق یوں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے ؛ سینما ہے یا صنعت آذری ہے
وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا ؛ یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ عہدِ کہن کا ؛ یہ تہذیبِ حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی ؛ وہ بتخانہ خاکی یہ خاکستری ہے

مندرجۂ بالا اشعار کا ایک ایک لفظ اس حقیقت کی نقاب کشائی کر رہا ہے کہ سینما ہمارے لئے ایک

لعنت ہے۔ لہٰذا یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جس طرح ہو سکے ہم اس سے چھٹکارا حاصل کریں۔ سینما فی الحقیقت ہمارے مذہب اور ایمان کو خراب کرنے والی چیز ہے لیکن وائے نادانی ہم "کرشن سداماں" اور "الہلال" اور اس قسم کی فلموں کو دیکھ کر تحسین و آفرین میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ بات ہمارے لئے قابل شرم نہیں ہے کہ ایک معمولی حیثیت اور معمولی اخلاق کا انسان کرشن جی کی تمثیل بنکر پردہ سیمین پر رقص کرے، بنسری بجائے۔ یا عورتوں کی محفل میں ان سے چھیڑ خانی کرے۔ افسوس اور صد ہزار افسوس! میں نہیں سمجھتا ہماری ذہنیت اس قدر کیوں خراب ہوگئی ہے۔ خدا کا پیارا کرشن۔ بھگوان کا اوتار کرشن دنیا کی متبرک ہستیوں میں سے ایک متبرک ہستی جس کے اوصاف حمیدہ اور صفات ستودہ ہمارے لئے شمع ہدایت ہونا چاہیئے۔ لیکن سینما میں وہ اس طریقہ سے دکھائے جائیں۔ خدا کا نبی۔ اللہ کا پیغمبر، دنیا کا مصلح مگر پردۂ سیمین پر اس کی یہ حالت۔ اے ہندوستان کے رہنے والو! اور مسجد و مندر پر لڑنیوالو!! تمہارے لئے یہ مقام افسوس ہے۔ کہ تمہارے مذہب کے بانیان کرام کے نام پر سینما میں وہ لوگ کام کریں جن کا مذہب کے ساتھ نام تک کا بھی تعلق نہیں۔ مذہبی روایات کو وہ لوگ اسٹیج پر پیش کریں جن میں تمام دنیاوی عیوب اور اخلاقی نقائص پائے جاتے ہوں۔

گریٹا گاربو

جناب سید علی رضا صاحب (عثمانیہ)

(سلسلہ کے لئے دیکھئے رسالہ فلم جلد ا نمبر ۹)

اپنی زندگی کی عظیم ترین لطافتوں کا ایثار کرکے اس نے آرٹ کی خدمت کی ہے اور اپنے کردار کو ہر قسم کی آلائشوں سے ہمیشہ پاک رکھا ہے۔ پبلک زندگی میں آنے کے بعد انسان کا کردار مخفی نہیں رہ سکتا لیکن جن کی زندگی برائیوں سے پاک ہو انھیں کوئی خطرہ نہیں۔ گریٹا کو اپنے نفس کی صداقت پر ہمیشہ اعتماد رہا اور باوجود اسکے خلاف پروپگنڈے ہونے کے وہ اپنے لائحہ عمل پر گامزن رہی اسی لئے آج لوگوں کے دلوں میں اسکی عظمت ہے اور ہر جگہ اس کی عزت کی جاتی ہے۔ جب وہ اپنی زندگی کے عظیم ترین مستقبل کا تصور لئے ہوئے گھر سے روانہ ہوئی تو پہلی ہی منزل پر قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ نیویارک کے متعلق اسکا خیال تھا کہ بہت پر فضا مقام ہوگا لیکن اُسے نا امید ہونا پڑا۔ بلند مکانات گنجان آبادی، کاروباری شور وغل، گرم آب وہوا نے اسکی رومان انگیز طبیعت کو مکدر کردیا لیکن وہ ارادہ کرچکی تھی اور اپنے استقلال کی قیمت سے بھی واقف تھی۔ نیویارک میں زیادہ دن ٹھرنا فضول تھا اسلئے یہ لوگ کلیفوا روانہ ہوئے اور جب لاس انجلس پہونچے تو ہالی وڈ والوں نے ان کا استقبال کیا۔ تصاویر اتاری گئیں گلدستہ پیش کئے گئے یہ لوگ یہاں سے بذریعہ موٹر ہالی وڈ پہونچے۔

مسٹر وکٹر نے سانٹا مونیکا میں ان لوگوں کے قیام کا انتظام کیا تھا۔ چونکہ یہ مقام ساحل سمندر کے قریب واقع تھا اور آب وہوا بھی پر فضا تھی اس لئے گریٹا نے اس مقام کو بہت پسند کیا اور اسے اطمینان ہوگیا کہ اب وہ اپنے نصب العین کے حصول میں زیادہ دشواری محسوس نہیں کریگی۔ یہاں اُسے چند دن آرام کے لئے مل گئے۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہالی وڈ والوں نے اب تک گریٹا کو غیر اہم سمجھ رکھا تھا۔ بہرحال اُسے امتحاناً کچھ پارٹس دئے گئے تھے جس کے ختم پر انہوں نے تصفیہ کیا کہ گریٹا قطعی غیر موزوں ہے جب مسٹر اسٹلر کو معلوم ہوا تو وہ بیحد غضبناک ہوئے اور کہا کہ "میں ڈائریکٹ کروں گا"۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی گریٹا کا میک اپ کیا اور لائٹ کو ترتیب دیکر مختلف پہلوؤں سے تصاویر اتروا کر ثابت کردیا کہ گریٹا حقیقت میں قابل نظر انداز نہیں۔ چنانچہ اُسے "دی ٹورنٹ" نامی فلم میں ہیروین کا پارٹ

دیا گیا۔ اس فلم کو مسٹر ہل ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ گاربو کو یہ پسند نہ تھا کہ ایک غیر مانوس شخص ڈائریکٹ کرے اس کے لئے زبان اور سارا ماحول غیر مانوس تھا وہ گھبرا کر گھر لوٹ جانا چاہتی تھی لیکن مسٹر اسٹلر نے اُسے سنبھالا۔ چنانچہ اب تک وہ ان دنوں کی یاد سے گھبرا جاتی ہے۔

"دی ٹورنٹ" نامی فلم کے اختتام سے پہلے ہی ڈائرکٹر نے محسوس کیا کہ گاربو میں اداکاری کی عظیم ترین صلاحیتیں موجود ہیں۔

جب اسٹوڈیو میں پہلی بار اس کی نمائش ہوئی تو جملہ عہدہ داروں نے متفقہ رائے ظاہر کی کہ گاربو ایک دن سارے عالم کو مسخر کر لیگی۔

بالآخر "دی ٹورنٹ" کی نمائش ہیوالی ہل کے ایک سینما میں ہوئی۔ فلم شروع ہونے سے پہلے اداکاروں اور ان تمام لوگوں کا تعارف کرایا گیا جنہوں نے اس فلم سے متعلقہ خدمات انجام دی تھیں۔ گریٹا کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں کی لیکن جب فلم ختم ہوئی تو ہر شخص گریٹا کے دیکھنے کا متمنی تھا۔ اخباروں اور رسالوں میں اسی کے تذکرے ہونے لگے۔ شہرت کی دیوی گریٹا کی قدمبوس ہوئی اور وہ لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرنے لگی۔

ہالی وڈ والے گاربو سے اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً ہی اسکے لئے دوسرے فلم کی تیاری شروع ہوئی اس فلم کا نام ٹمپرس رکھا گیا۔ گریٹا نے اس شرط پر رضامندی ظاہر کی کہ اگر مسٹر اسٹلر اس فلم کو ڈائریکٹ کریں تو وہ پارٹ کریگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مسٹر اسٹلر کو ہدایات دی گئیں اور وہ فلم کو ڈائریکٹ کرنے لگے۔ ہالی وڈ والے ان کے ڈائریکشن پر اعتراض کرنے لگے۔ مسٹر اسٹلر نے کام سے ہاتھ اٹھا لیا مسٹر بنلو کو انکی جگہ مقرر کیا گیا۔

"ٹمپرس" کی تیاری کے دوران میں اکثر اخباری نمائندے گریٹا سے ملنے آئے لیکن وہ ان سے ملنے سے انکار کرتی رہی۔ وہ تمام متعجب تھے کہ ہمیں ایک ایسی اداکارہ ملی ہے جو اپنے متعلق کچھ بیان دینا نہیں چاہتی۔ بہر حال دن گزرتے گئے اور گریٹا ترقی کرتی گئی۔ کچھ ہی دن بعد مسٹر اسٹلر کا معاہدہ ختم ہو گیا۔ ایم۔ جی۔ ایم والوں کو اب اُن کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ اب گریٹا کو چاہتے تھے چنانچہ معاہدے کی تجدید ہوئی۔ گریٹا نے "ٹمپرس" میں "ٹورنٹ" سے بہتر مظاہرہ کیا اور ہر جگہ قدر سے دیکھی گئی۔ ٹمپرس کے بعد گریٹا کو اطلاع دی گئی کہ جاک گلبرٹ کے ساتھ آئندہ فلم میں پارٹ کرنا ہو گا جس کا نام "فلش اینڈ دی ڈیول" تھا۔ اس فلم کی تیاری کے بعد گریٹا الجھن میں پڑ گئی تھی جو آئندہ بیان کیجائیگی۔

(باقی آئندہ)

place? It is a secret which has been found out by the society girls and so they do not dare to enter the companies. Those who want to join the film, have to carry out certain "duties". The instructions of the directors are to be carried on and the sweet words of the Producers and Proprietors are to be heard patiently though filled with poisonous effects.

But those society girls can join without any danger of persuation or compulsion who can make the directors yield to their words, or who have got their husbands or other nearest relatives in the company, or who can control some power upon the film directors and Producers etc. Devika Rani and Sadhona are examples of that class.

At one place, Aruna Devi remarks, "it is seldom that a nation, amongst whom women have not been treated on equality basis, has thriven or done anything worth remembering."

Quite so! I would like to question whether it is the only aspect of Indian woman in which she wants equality with men in India? I would like to know in what other aspects of life India has given freedom and equality to woman, that Aruna Devi is trying to press equality in this branch also, a branch which should be kept in the last when the problem of equality of woman with man is taken into consideration.

Mere outwardly attractions of the film life cannot convince the society girls to join it, until its inwardly darkness and evils are completely removed.

S. Fateh Lal

A. R. Kardar

D. K. Bose

Should Society Girls Join the Screen ?

BY

MAHSHER ABIDI, B.A., M. SC.

The above problem has been worrying the Indian minds for a long time. But I think it tackles the minds of those people only who do not consider its various aspects in the light of the present social atmosphere. Some people think that Society girls should take part in the film and some say "no".

Let us first look with open eyes at the studio's atmosphere and the life of that place, which has its own peculiar characteristics, and which mould a person accordingly.

No body can deny the truth that surroundings affected a great deal upon the bearing and character of a person. And when there all kinds of attractions, there are all sorts of presuations and in most cases compulsions towards evils, and towards the allusions of a beautiful and interesting life. How is it, then, possible for a society girl, to lead a noble and pious life amid the streams of such attractions and persuations? How many of them are such who have not yielded to the attraction and glitter of enchanting atmosphere? Very few, ,at most, one percent, That one percent ought to possess a very strong character—a character not to be swept by any attraction, persuation or compulsion.

I have reasons to believe that a society girl, when enters the filmdom does not remain the same what she was .

A society girl's life is quite different from that of an actress. She has different sort of family life to lead, a life of calmness and peace, a life free from many anxieties. The actress has got many people to please. The truth of these owrds can only be found when one learns the real state of mind and life of a film actress or studies their private lives.

I do not believe in the owrds of Aruna Devi when she says, "the time is soon approaching when all Indian moralists will come to realise the importance of a refined woman as a film actress as a factor in social progress and national regeneration." Because, a society girl's characteristics are her modesty, self-respect, reservedness, and grace. These precious jewels are lost when a girl becomes free, and when she becomes free, she loses all her modesty grace and charm. And it is an undeniable fact, that until a girl is free, and until she has experienced the various aspects of life, she cannot express herself as she ought to do. She has hesitation in acting which spoils the acting. As she does not and cannot move her whole person freely in the presence of all the people she finds it difficult to express her true feelings and consequently lacks in expression, which is the very soul of acting.

Many complications make the life of an actress bitter, though outwardly she may look very happy. To say that men deprive a society girl of her right to join the film career is not right. ' On the other hand, sensible men, knowing the ups and downs of film-life, and considering the dark and demoralising influences of the studios try to check them from losing what they possess —to save them from falling into the depths of a misleading path, from where it is very difficult to emerge.

Aruna Devi, in her article entitled "Should Society Girls join the Screen" (published in the Movies Film Weekly, Delhi dated April 16, 1939) has given a few names of society girls, for instance, Shanta Apte, Durga Khote, Devika Rani and Sadhona Bose who joined the film and proved a success. Exceptions are always found side by side with general principles. And it is no wonder if four or five ladies of the Society have joined the film line when there are millions of them who have not paid the slightest heed to this line. Why is it so when it is such a paying job? Why the society girls do not join film when they have not much to exert when compared with other jobs for which they have to do much hard work and earn very little. There are, in every film Company, hundreds of actresses mostly belonging to the prostitute class, whose place can be taken by society girls, but why is it that very few have taken their

way to do this is to make a reduction in the salaries. Famous, popular and experienced stars should not be turned out. Instead new-comers may be stopped.

The retrenchment of the hands should not be based upon communal or partial basis, the considerations of merit and skill should be based upon honesty and not favouritism and partiality.

These are a few points according to which the Producers may adjust themselves in the present circumstances.

It has been brought to our information that some of the film companies have already begun to make fundamental changes. One of these is the retrenchment of the stars.

So far as our personal experience, observations and informations are concerned, we are in a position to say that most of the companies are affected with the poisonous germs of communal hatred and prejudice which is a matter of great pity. And it is, to tell the truth, the Muslim class of the stars which falls prey to it. We are right when we say that 60 percent of the Cinema income comes from Muslim pockets, why then the producers treat the Muslim stars improperly and do not care for their art and skill. This is a question to be pondered by everybody.

We have received informations very recently about the Muslim stars who, although had a brilliant career althrough their services and who are much better than many Hindu actors, are being turned out of services under the pretention of the present war-effects. But why should this calamity fall upon the Muslim Actors only?

Very recently we read in a paper that Mazhar Khan has been turned out of service from the Ranjit. Why only Mazhar Khan should be turned out and not many other hopeless persons who worth nothing.

We have also heard of Bombay Taklies that it is turning out its Muslim elements one by one, a few of the Muslim actors, much better in all respects, than Ashok Kumar and many other Hindu stars, have been turned out, their only fault being that they are Muslims. We have also heard that Sagar Company has given notice to Yakub and Mahboob. Is it not an injustice done to the Muslim stars? Such a policy, the producers should remember, cannot last long. We have been warning, and a time is sure to come when the Muslim Public will boycott the films, and then the Producers will open their eyes that without co-operation of the Muslim stars, it is very difficult for them to move a step further.

The consequent effects of the war are well known, but why the Muslim stars should suffer the calamity alone? why should it not be divided equally among the Muslims and Hindus both?

Editorial

War and Film Industry.

It is but natural that when war breaks out in any country, its whole organisation and machinery is affected, and consequently alterations and changes are sure to be made in every branch of life.

It is not that only those countries are affected which are involved in the war, but those also which are connected in any way with the one or other.

India, therefore, has also been affected by the recent outbreak in the European Countries.

India has many independent Industries to be proud of. But at the same time it has also a few such industries for which it has to depend upon foreign countries; one of these and most paying Industries is the film Industry, this industry is still in its infancy and its case is like that of a child which has just come out of its cradle and begining to creep forward. Now, at this stage, what would happen to it if a huge stone is thrown in its path. The answer is quite simple. The child will not be able to move forward, as he has not power enough to climb this hillock. Such is the case with the Indian film Industry The present war has badly affected its progress and development. The war has given a severe blow to the Indian film Industry. Its dependence upon other Countries for "raw materials" is becoming a great handi-cap. It cannot pull on swiftly. It has to adopt itself according to the prevailing conditions of the surroundings—there is no other "go" for it.

Every one knows that the raw-materials for "films" are imported in India from foreign countries, and due to unsafe conditions of land and sea, the material cannot be imported in sufficient quantity, the result being the rising of rates of the material to a very unexpected scale.

Such being the state of affairs, the machinery of this industry is sure to be affected in various ways,

(*a*) "Raw material" being very dear, production of the "pictures" will be reduced to a great extent.

(*b*) When the number of pictures produced yearly will be reduced, the companies will not be able to maintain large staffs, resulting in the reduction of expenses and retrenchment of the employees.

(*c*) The companies will keep a very limited staff and produce only such stories which give them security for success.

(*d*) Many of the film companies will stop their work, and numberless hands will be thrown out of employment.

(*e*) The Cinema Halls, not having sufficient and good pictures will not be able to mantain their income, and will be in danger of being closed.

These are the inevitable effects of the war.

The problem becomes very complicated when we think of the retrenchment of the staff, as there will be no other means for them to earn their bread, because all the companies will be affected at one and the same time.

This is the problem for the producers to solve.

As the celluloid and other chemicals will be scarcely imported, the Directors ought to adjust themselves accordingly, i.e., they should prepare films of shorter length compared to their previous long pictures.

They should leave the habit of coining their own stories or copying from the English films, and select carefully stories from well-known writers of to-day, writers who are popoular among the people.

Unnecessary or additional staff has to be reduced, to curtail the expenses, or the

THE FILM

A MONTHLY JOURNAL

OF

SAYYID SA'AD ULLAH QADRI

MEDAL COMMITTEE

Vol. 1., No. 10. *Hyderabad-Deccan* 31st October 1939

CONTENTS

ENGLISH SECTION

URDU SECTION

Per Copy -/1/8

ادبِ لطیف اعلیٰ قصے کہانیوں اور ڈرامہ کی نشر و اشاعت کیلئے

انٹرنیشنل ٹریڈنگ کارپوریشن لمیٹڈ لاہور

کا

ماہوار

رسالہ

افسانہ

زیرِ سرپرستی آنریبل کپتان سردار سر سکندر حیات خان صاحب

ریونیو ممبر پنجاب گورنمنٹ سابق گورنر پنجاب بالقابہ

مدیرانِ اعزازی

ملک محمد اسلم خان ایم۔ اے (کیمبرج) بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور

سردار موہن سنگھ ایم۔ اے، پی ایچ ڈی

سید عابد علی عابد ایم اے ایم او ایل ایل ایل بی

(سالانہ قیمت دو روپیہ ۲)

([illegible])